مقدمہ

ہندوستان کی علمی دنیا میں جناب خواجہ غلام السیّدین صاحب کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے۔ آپ اردو اور انگریزی کی تقریر و تحریر پر یکساں قادر ہیں اور نطق و قلم میں اعجازی کمالات حاصل کر چکے ہیں۔ اس اعجاز پر علم کی دولت اور مطالعہ کی کثرت نے سونے پر سہاگے کا کام کیا ہے، موصوف نے اپنی طالب علمی کے زمانہ میں دارالعلوم علی گڑھ میں نام پیدا کیا اور علی گڑھ سے پہلکر لیڈس کے علمی حلقوں میں آفتاب علم بن کر چمکے۔ اب وہ مسلم یونیورسٹی ٹیچرس ٹریننگ کالج کے پرنسپل ہیں اور جس عمدگی، تدبّر، اور کامیابی کے ساتھ اپنے فرائض منصبی انجام دے رہے ہیں اُسی انہماک کے ساتھ اُن کا علمی مطالعہ جاری ہے، چنانچہ آپ کے نتائج فکر اکثر رسالوں میں دیکھے جاتے ہیں اور ارباب ذوق ان مقالوں کو ہمیشہ قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

سیدین صاحب کا زیر نظر افسانہ ”شہیدانِ وفا کا خوں بہا کیا“ کے عنوان سے

علی گڑھ میگزین میں شائع ہو کر مقبول عام ہو چکا ہے ہم نے
یہ مناسب سمجھا کہ اس کو کتابی صورت میں شائع کر کے ایک
خوبصورت اور جداگانہ شکل میں اہل ملک کی خدمت میں
پیش کروں۔ اس افسانہ کی چند در چند خوبیاں اس جرأت
کی ذمہ دار ہیں۔ آرٹ کے لحاظ سے یہ افسانہ مکمل اور نہایت
دلکش ہے۔ افسانہ کے ہیرو ڈاکٹر علی حسین کا کیرکٹر اور کریم نگر
کی فضا دونوں بدرجۂ اتم کامیاب ہیں، افسانہ ختم کرتے ہی
علی حسین ہمیں چلتا، پھرتا، کام کرتا ہوا، سوچتا ہوا، تدابیر
کرتا ہوا نظر آنے لگتا ہے، ہم اس کے چہرے پر خوشی کے
آثار دیکھ سکتے ہیں، اُسے رنجیدہ دیکھکر ملول ہوتے ہیں، اُس
کا تردد ہماری پریشانیوں میں اضافہ کرنے لگتا ہے۔ اور
اُس کی کامیابی ہماری مسرت کا موجب ہوتی ہے، علاوہ
ازیں کریم نگر کو (جو غالباً پانی پت کے پڑوس میں کوئی مقام
ہے) تیجیے۔ تحصیلدار صاحب کی روش۔ ڈاکٹر بشن چند
کا طرز عمل، عام آبادی کی جہالت، قدامت پسندی، اور
ناعاقبت اندیشی یہ سب اس قدر صحیح اور واضح انداز میں
تحریر کئے گئے ہیں کہ بیساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

قومی کام کرنے والے غریب پر ہندوستان میں جو مصیبت
آتی ہے اور خصوصاً مسلمانوں میں جس طرح اُسے نوازا جاتا ہے
اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کرسکتے ہیں جن کو قومی کاموں میں
اپنا وقت صرف کرنا پڑتا ہے۔ قرونِ وسطیٰ کی روایات ابتک
ہمارے دماغوں پر مسلّط ہیں اور ہم اس کے لیئے ہرگز تیّار
نہیں ہوتے کہ ایک قومی رضا کار کو پسندیدہ نگاہوں سے دیکھیں
حالانکہ یہ بات عرصہ ہوا پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ ہماری
فلاح و بہبود صرف اُن پُرخلوص رضا کاروں کی ذات سے
وابستہ ہے جو شب و روز خدمتِ قومی میں مصروف رہتے
ہیں اور جن کو "نہ ستائش کی تمنّا نہ صلے کی پروا"

ڈاکٹر علی حسین انہی پُرخلوص قومی رضا کاروں کی جماعت کا
ایک پُرجوش، باہمّت، راست باز رُکن ہے جس کی چند سالہ
کوششوں نے کریم نگر کی کایا پلٹ دی اور ایک گندے
ناپاک، تنگ و تاریک کوردیہہ کو دُنیا کا ایک حسین، خوش منظر
پرصحت، اور بیدار خطّہ بنا دیا۔ یہ ایک رضا کار کا ایک اور
صرف ایک کارنامہ ہے۔

رضا کار کا بھی پُرخلوص اور باہمّت ہونا یعنی علی حسین ہونا

ناگزیر ہے، ورنہ کامیابی محال ہو جائے گی۔

اس افسانہ کے شایع کرنے کا مقصد یہ ہے کہ عوام الناس کو معلوم ہو سکے کہ غریب رضاکار پہ کیا گزرتی ہے اور کوتاہ اندیش و خود غرض لوگ کس قدر افسوسناک طریقے سے اُس کی جانِ حزیں پر نرغہ کرتے رہتے ہیں۔

کیا عجب کہ اس افسانہ کی اشاعت سے پبلک کو یہ بھی معلوم ہو جائے کہ ہم کیسی دُنیا میں آباد ہیں، ہماری کیا کیا ضروریات ہیں، ہماری زندگی کیسے ابتر اور گندے ماحول میں گزر رہی ہے، کیونکہ کریم نگر جہاں پانی پت سے قریب ہی وہاں دوسرے شہروں سے بھی دور نہیں۔

یہ افسانہ شاید یہ بھی سمجھا سکے کہ ہمارے ملک کے حکیموں اور ڈاکٹروں کا معزز طبقہ نیز تعلیم یافتہ نوجوانوں کی وہ جماعت جو "کچھ کام" کرنا چاہتی ہے کس طرح اس افسانہ کے ہیرو اور اُس کے رفقار کار کے طرزِ عمل کو مشعلِ راہ بنا کر اپنی دنیا و عقبیٰ سنوار سکتی ہے۔

میں جناب خواجہ صاحب کا ممنونِ کرم ہوں کہ اُنھوں نے مجھے اس حد درجہ "مفید" اور قابلِ قدر افسانہ کو

کتابی صورت میں شایع کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

خاکسار

سید الطاف علی بریلوی

بی، اے (علیگ)

نینی تال روڈ بریلی

۱۰۔ نومبر سنہ ۱۹۴۴ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہ

شہیدِ وفا

کریم نگر ایک سوئی ہوئی بستی ہے جس کا رشتہ تاریخ کے راستے مہا بھارت کے زمانے سے ملتا ہے۔ اس کی آبادی کوئی تیس ۳۰ ہزار نفر کی ہوگی۔ بہت سے قدیم زوال آمادہ "اشرافوں" کے خاندان اس میں بستے ہیں۔ وہ تیز اور تند ہوائیں اور طوفان جو دنیا میں ہل چل مچاتے رہتے ہیں اس آبادی سے نا آشنا ہیں قرب وجوار کے بڑے بڑے شہروں اور بعض اوقات معمولی قصبوں میں بھی ان سماجی اور اقتصادی انقلابات کے اثر محسوس ہوئے لیکن یہ چھوٹی سی دنیا ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اس کے پڑوس میں مٹی کے تیل کے ٹمٹماتے ہوئے لیمپوں کے بجائے بجلی کے قمقمے روشن ہوگئے لیکن اس کی آنکھیں نہ کھلیں صنعت وحرفت کے نئے راستے کھل گئے، کارخانوں کی چمنیوں سے دھواں نکلنے لگا، آگ اور پانی اور بجلی کے پرانے دیوتاؤں کو سائنس نے انسان کا خادم بنا دیا، لیکن یہاں پرانی دستکاریاں جوں کی توں قائم ہیں مگر اب ان میں پہلی سی چابک دستی اور نفاست کا اظہار کہاں؟ اب ان کی قدر کرنے والے کہاں رہے؟ مشین کی سستی چیزوں نے ان کا بازار مندا کر دیا ہے۔ لوگ غریب ہوتے چلے جاتے ہیں کیونکہ زمین کی

آمدنی گھٹ گئی ہے اور ان میں اتنی اپچ نہیں کہ وہ نئے راستے نکال سکیں۔ بچوں کو تعلیم دلانے کا دستور نہیں۔ لڑکوں کو بعض بعض روشن خیال، شرفا نے مدرسے میں بھیجنا شروع کر دیا ہے لیکن وہ دسویں جماعت تک بھی اپنی تعلیم پوری نہیں کرتے۔ لڑکیوں کی تعلیم تو گویا کفر کے مرادف ہے۔ اس لیئے نئی نسل میں بھی کوئی اثرات ایسے نہیں جو اس جمود میں حرکت پیدا کریں۔ لوگوں کی سب سے بڑی صفت قناعت ہے جو شریف خاندان تیس سال پہلے سو روپے ماہوار پر گذران کرتے تھے وہ اب پچیس روپئے پر قانع ہیں۔ تنگی اُٹھاتے ہیں، افلاس کی مصیبت اور ذلّت برداشت کرتے ہیں لیکن کوئی ہاتھ کا کام یا تجارت یا محنت کرنا شرافت میں بٹّہ لگاتا ہے اور اس کے لیئے وہ تیّار نہیں۔ شرافت بجائے خود رنگ کی طرح ایک مستقل صفت ہے جو کسی خاص خدمت یا کوشش کی محتاج نہیں۔ خدا کا عطیہ اور پیدائش کا کمال ہے۔ کسی کے حصّے میں آتی ہے کسی کے حصّے میں نہیں آتی۔ جن کو مل گئی ہے وہ اس پر خوش ہیں۔ فخر کرتے ہیں اس کے بھروسے پر دوسروں پر فوقیت جتاتے ہیں اور ان پر حکم چلاتے ہیں۔ جن کو نہیں ملی وہ محنت مزدوری کرتے ہیں اور چھوٹے پیمانے پر تجارت اور صنعت و حرفت کا کاروبار چلاتے ہیں اور ان کی مالی حالت گزشتہ تیس برس میں پہلے سے کچھ بہتر ہو گئی ہے۔ لیکن ان کی سماجی حیثیت وہی ہے جو پہلے تھی۔ شرفا نہ ان سے ملتے جلتے ہیں نہ ان کو ابھارنے کی فکر کرتے ہیں۔

نہ ان کو اپنے تمام انسانی حقوق سے فائدہ اُٹھانے دیتے ہیں۔ دونوں ایک ہی ماحول میں رہتے سہتے ہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہت سی اَن دیکھی زنجیریں ان کو ایک دوسرے سے علٰحدہ رکھتی ہیں۔ اور وہ اپنی جگہ قانع اور مطمئن ہیں تنگ و تاریک گلیوں میں رہتے ہیں، غلاظت اور بیماری ان پر مسلّط ہیں، تعلیم سے بے بہرہ ہیں، ناکارہ اشرافوں، کی ڈانٹ اور گالیاں بھی سُن لیتے ہیں لیکن چونکہ دو وقت روٹی کھانے کو مل جاتی ہے اس لئے اپنی حالت کو بدلنے کا خیال نہ ان کو آتا ہے نہ ان کے والیانِ نعمت کو۔

غلاظت اور بیماری! یہ دو نوں مصیبتیں جو خدا اپنے نیک بندوں کے صبر اور شکر کا امتحان کرنے کے لئے بھیجتا ہے غریب اور امیر، شریف اور رذیل، ہندو اور مسلمان سب کے لئے مشترک ہیں۔ کریم نگر گندگی کے اعتبار سے ہندوستان کے چوٹی کے شہروں میں سے ہے۔ گلیاں اور بازار چونکہ سب کی مشترک ملکیت ہیں اس لئے کسی کی ملکیت نہیں اور ہر شخص نہایت بے دھڑک اپنے گھر کا تمام کوڑا کرکٹ اور غلاظت گلیوں اور بازاروں میں ڈال دیتا ہے۔ سڑکوں کی باقاعدہ مرمّت موجودہ نسل کی یاد میں کبھی نہیں ہوئی۔ اگر کوئی بڑا افسر اپنی شامتِ اعمال سے کبھی اس طرف آجاتا ہے تو اس خاص سڑک کی تھوڑی سی عارضی مرمّت کرا دی جاتی ہے جس کو اس کی قدمبوسی کا شرف نصیب ہوتا ہے۔ لہذا گرمیوں میں گرد اور برسات میں پانی

کے گڑھے۔ یہ ہے راستہ چلتوں کی قسمت۔ رسم پوری کرنے کے لئے ایک کمیٹی بھی ہے لیکن اس کے ممبر ایسے لوگ ہیں جن کو خدا نے عقل اور احساس کے ہنگامہ خیز عطیوں سے بالکل محفوظ رکھا ہے اور جن کو فوائد عامّہ کی ذمّہ داری کا مفہوم بھی معلوم نہیں۔ علاوہ بریں کمیٹی پر مقامی حکام کی حکومت ہے اور انھیں اپنے ذاتی دھندوں اور مفاد پرستی سے اتنی فرصت نہیں کہ وہ ان امور کی طرف توجّہ کریں۔ قصبے میں بجلی آسکتی تھی، نہیں آئی۔ پانی کے نل لگائے جاسکتے تھے نہیں لگائے گئے۔ جو چیز ہمارے بزرگوں کے لئے بس تھی وہ ہمارے لئے بھی بس ہے نئے خیالات اور نئی اسکیمیں زیادہ تر شیطان کی ایجاد ہیں اور اگر شیطان کی ایجاد نہیں تو یقیناً شہر کے سرداروں کے مفاد کے خلاف ہیں۔ ان میں روپیہ صرف ہوتا ہے۔ دردسری کرنی پڑتی ہے۔ بہتسے پانی بھرنے والوں، لمپ جلانے والوں (اور اُن کے سرپرستوں!) کا پیٹ کاٹنا پڑتا ہے۔ لہذا ہمیں آرام سے رہنے دو۔ دُنیا میں کافی شور وشغب اور بدامنی ہے۔ اس غریب قصبے کے درپے کیوں ہوئے ہو؟ تمھاری آنکھیں مغرب کی جھوٹی روشنی سے چکاچوند ہوگئی ہیں، عقل اور مصلحت کا تقاضا تمھاری سمجھ سے باہر ہے۔ خدا کے کاموں میں خواہ مخواہ دخل نہ دو...... یہ ہے لوگوں کا عام اندازِ خیال جس میں اہلِ ثروت اور اہلِ مذہب دونوں شامل ہوگئے اور "عوام" جن کی خاطر اس قسم کی تجویزیں

کی جاتی ہیں وہ بھی اس خیال سے موافق ہیں اور ان دیکھے، ان سمجھے خطروں اور تبدیلیوں سے گھبراتے ہیں۔

اب آپ سمجھ گئے، آپ کو اندازہ ہو گیا؟ یہ ہے وہ بستی جس کا میں آپ سے تعارف کرانا چاہتا ہوں اور یہی ہے وہ بستی جس میں ۱۸ ستمبر ۱۹۲۹ء کو ایک نوجوان ڈاکٹر جس کو میڈیکل کالج سے نکلے چند ہی سال ہوئے تھے سات بجے شام کی گاڑی سے وارد ہوا۔ اس کے ساتھ صرف ایک بستر تھا اور دو ٹرنک اور (جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا) جوش، صداقت، عاقبت ناشناسی، عجلت پسندی اور جرأت کی صفات۔ لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہے اس کے سامان کا جائزہ لیتے وقت ان صفات کو نہ تو اس قلی نے دیکھا جو سامان کو اٹھا کر باہر لے گیا، نہ اس ٹکٹ بابو نے جس نے ٹکٹ لیکر اسے اسٹیشن سے باہر جانے دیا اور باوجود کھلی آنکھوں کے یہ محسوس نہ کیا کہ وہ اس عافیت پسند بستی میں کس ہنگامے کو داخل کر رہا ہے! اور اس کا زیادہ قصور بھی نہیں کیونکہ اگر آپ بھی اس وقت ٹہلتے ہوئے پلیٹ فارم پر پہنچ گئے ہوتے تو اس ڈاکٹر کو دیکھکر اس کی طرف سے کسی خطرے کا اندیشہ نہ کرتے۔ لمبا قد، سانولا رنگ، اُبھری ہوئی پیشانی، گٹھی ہوئی ٹھوڑی، ہونٹ جو عادتاً بند رہتے تھے۔ چہرہ متین لیکن کبھی کبھی تبسم آشنا جس سے خوش مزاجی کا شبہ ہوتا۔ ان سب میں کونسی ایسی بات ہے جو آپ غریب ٹکٹ بابو پر ناراض ہوں کہ

اس نے فتنے کو آنے ہی کیوں دیا؟ ہاں ایک بات بھول گیا اور وہ یہ کہ اس کی آنکھیں بہت سنجیدہ، بہت گہری بہت اثر آفریں تھیں۔ وہ مخاطب کو ہمیشہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا تھا معلوم ہوتا تھا اس کی صاف نظر روح کی گہرائیوں تک اتر جائے گی، ان پردوں کا احترام نہ کرے گی جو ہم اپنے خیالات اور جذبات پر مصلحت یا ریاکاری یا مجبوری یا خوف کی وجہ سے ڈال لیا کرتے ہیں۔ بعض لوگ ایسی آنکھوں کو پسند کرتے ہیں بعض ناپسند کرتے ہیں۔ اپنی اپنی طبیعت ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ صاف اور بے ریا دل کا آئینہ ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ محض گستاخی اور دیدہ دلیری ہے۔ خدا جانے!

(۳)

ڈاکٹر علی حسین کو مکان تلاش کرنے میں وقت ہوئی قصبے کا جو حصّہ ذرا صاف اور کشادہ تھا وہاں کرایہ زیادہ تھا اور ان کی استطاعت کم۔ اور جہاں کرایہ کم تھا مکان تنگ و تاریک اور غلیظ گلیوں کے اندر تھے۔ دن بھر تنہا اس اجنبی قصبے میں دوڑ دھوپ کی مگر کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ آخر کچھ سوچ کر "تیلیوں کے محلّے" میں ایک مکان لیا جو دوسرے محلوں کی طرح کافی خراب اور گندی حالت میں تھا سارے محلّے کا بدلنا تو آپ جانتے ہیں انسان کے بس کی بات نہیں مگر چند ہی روز میں ڈاکٹر نے جہاں تک ہو سکا اپنے گھر کو صاف ستھرا کر لیا اور دروازے پر اپنے نام کا بورڈ لگا کر گویا اعلان

جنگ بھی کر دیا کہ ایک نیا ڈاکٹر شہر میں آبسا ہے۔ اس طرف سے ذرا فارغ ہوکر انھوں نے اپنی حالت کا جائزہ لیا۔ نیا شہر، اس میں کوئی ان کا شناسا نہیں کوئی مددگار نہیں۔ دنیا ضرور سامنے پڑی ہوئی تھی لیکن اس کو فتح کرنا کوئی سہل بات نہیں۔ اسباب دُنیوی میں سے بہت کم ان کے پاس اور وسائل اور ذرائع مسدود۔ لیکن ان کے کیسے میں زر کے بجائے ہمّت اور حوصلہ اور محنت کرنے کی خواہش اور خدمت کی اُمنگ بھری ہوئی تھی۔ ان کی تمام عمر مشکلات کا مقابلہ کرنے گزری تھی غریب گھر کا بچّہ اور وہ بھی نو عمری میں والدین کی سرپرستی سے محروم ہو جائے۔ اس کے لیے دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں۔ یا تو وہ ہمّت ہار کر اس خس و خاشاک میں شامل ہو جائے جو زندگی کے راستوں پر بھٹکتے پھرتے ہیں یا اپنے حالات سے جنگ کر کے انھیں زیر کرے۔ علی حسین نے دوسرا راستہ اختیار کیا تھا اور تیس سال کی مسلسل جنگ نے ان کی سیرت کو مستحکم اور پختہ بنا دیا تھا وہ ان لوگوں کی طرح لجلجا اور کمزور نہیں تھا جو عیش اور دولت کی گود میں پلتے ہیں اور عمر بھر دوسروں کی محتاجی کرتے ہیں اسے زندگی کے دھکّوں اور تجربوں نے فولاد کا بنا دیا تھا۔ اس میں تہذیب کی کمی، آداب مجلس سے ناواقفیت ہو لیکن زندگی کے مدرسے میں اس نے اعتماد ذات کا سبق پڑھا تھا اسے افلاس، دُکھ اور بیماری سے بہ ایں سابقہ پڑا تھا اور اس تجربے نے

اس میں سچی انسانیت اور ہمدردی پیدا کر دی تھی وہ دوسروں کے دُکھ کو اپنا دُکھ سمجھتا تھا کیونکہ ہر قسم کی آگ میں سے خود نکل چکا تھا اور جو شخص اس بھٹی میں پک جاتا ہے اس کی پختگی میں کسر نہیں رہتی!

کام کس طرح شروع کیا جائے؟ اس کی کسی سے ملاقات نہ تھی۔ البتہ اسکے پاس چند تعارف کے خطوط تھے۔ اس کے ایک پروفیسر نے ایک خط ڈاکٹر بشن چندر کے نام دیا تھا جو کریم نگر کے اسپتال میں سرکاری ڈاکٹر تھے یہ ان سے جا کر ملے۔ بہت مہذب اور با اخلاق آدمی تھے۔ تپاک سے باتیں کیں کہنے لگے کہ اس شہر میں ڈاکٹروں کی کھپت تو بہت کم ہے کیونکہ لوگ غریب ہیں فیس ادا کرنے کی مقدرت نہیں رکھتے۔ مگر میں جو کچھ مدد آپکو دے سکتا ہوں اُس کے لئے حاضر ہوں۔ اگر آپ چاہیں تو چند روز تک اسپتال میں آکر میرے ساتھ کام کریں۔ اس نے منظور کر لیا کہ اس طرح کچھ لوگوں سے شناسائی اور ملاقات ہو جائے گی اور یہاں کے علاج کا ڈھنگ بھی معلوم ہو جائیگا۔

اس کے بعد وہ شہر کے مالک مجازی یعنی عبدالرحمٰن خاں صاحب تحصیلدار کے پاس گیا۔ جو اس کے والد کو جانتے تھے موٹے تازے، گورے چٹے آدمی بڑی بڑی مونچھیں ہنستے تو کمرہ گونج اُٹھتا۔ کسی کی کمر تھپکتے تو اُسے ڈاکٹر بشن چند کی طرف رجوع کرنا پڑتا۔ گرم و سرد زمانہ دیکھے ہوئے، موقع شناس، وقت پر گرم، وقت پر نرم، زبردستوں کے سامنے شانِ عجز کا

اظہار، زبردست کے لئے غضب الٰہی کا نمونہ، زبان کے میٹھے، اپنے نفع نقصان کے صحیح نبّاض - ایمانداری کا بلند آہنگی سے دعویٰ لیکن اصول کی تیج نہیں - غرض ڈاکٹر بیچارے کو اور آپ کو تو کیا معلوم ابھی لیکن ان میں وہ تمام صفات تھیں جو ایک انسان کو کامیاب بناتی ہیں - نوجوان ڈاکٹر کو انھوں نے بہت نوازا، مفید مشورے دئے بتایا کہ کون لوگ ملاقات کے قابل ہیں اور کن سے پہلوتہی کرنی لازم ہے - پھر پوچھا کہ کہاں ٹھیرے ہو - بتایا کہ تیلیوں کے محلّے میں مکان لیا ہے - چونک پڑے، تعجب کے مارے آنکھیں باہر نکل آئیں، منھ کُھلا کا کُھلا رہ گیا، پھر اپنی حیثیت اور بزرگی کو یاد کر کے مونچھوں پر تین مرتبہ تاؤ دیا اور بولے:-

"کیا کہا؟ تیلیوں کے محلّے میں؟" علی حسین نے بہت سادگی اور اطمینان سے جواب دیا "جی ہاں تیلیوں کے محلّے میں کیا کوئی حرج ہے؟" زور سے قہقہہ مارا اور بولے "واہ میاں صاحبزادے واہ! آج کی ایک ہی کہی - تیلیوں کے محلّے میں مکان لیا ہے اور پوچھتے ہیں کیا کوئی حرج ہے!" ایک صاحب جن کی شکل بیمار چوہے کی سی تھی ان کی طرف مُڑ کر کہنے لگے "شنامرزا صاحب ہمارے ڈاکٹر صاحب نے تیلیوں کے محلّے میں مکان لیا ہے۔ دپھر اس کی طرف متوجہ ہو کر) میں ابھی

آپ کے لئے اس محلّے میں مکان کا بندوبست کرتا ہوں، تم سیدھے میرے پاس کیوں نہیں آگئے تھے۔ بہت مناسب کرائے پر مکان مل جائے گا۔ شریفوں کا پڑوس، صاف جگہ، تمھارے بہترین مریض بھی اسی گردونواح میں ملیں گے۔ ارے بھئی یہاں توسوائے اس محلّے کے اور کوئی جگہ انسانوں کے رہنے کے قابل نہیں۔

رام سروپ! رام سروپ! ادھر آؤ دیکھو میرذکی حسین صاحب کے پاس جاؤ اور اُن سے کہنا کہ وہ کنوئیں والے مکان کو صاف کرادیں ایک نئے ڈاکٹر صاحب اُسے لینا چاہتے ہیں میں نے ان سے دس روپیہ مہینہ ٹھیرالیا ہے۔" علی حسین ان کی یہ گفتگو حیرت سے سُن رہا تھا۔ جب رام سروپ جانے لگا تو وہ اس کی طرف پلٹے اور اس سے کہا "ٹھیرو، تمھارے جانے کی ضرورت نہیں۔" خاں صاحب آپ تکلیف نہ کریں میں مکان بدلنا نہیں چاہتا۔" "مکان نہیں بدلنا چاہتے! یہ کیوں؟ بھلا کوئی خواہ مخواہ شریفوں کا پڑوس چھوڑ کر رذیلوں کے ساتھ جا کر بھی رہتا ہے۔ اور یہ بھی دیکھئے کہ وہاں کس قدر گندگی اور غلاظت ہے۔ آپ چار دن میں بھاگ کھڑے ہوں گے۔ رام سروپ تم جاؤ۔"

ڈاکٹر کی پیشانی پر بل آگیا۔ ہونٹ ایک دوسرے سے پیوست ہو گئے لیکن اس نے اپنی معمولی سلیس آواز میں جو الفاظ کو تول تول کر نکالتی تھی

اور کبھی بے ضرورت جلدی نہ کرتی تھی جواب دیا دو تحصیلدار صاحب میں نے آپ سے کہہ تو دیا کہ میں اسی مکان کو پسند کرتا ہوں۔ میں اس کو چھوڑ کر کسی بہتر مکان میں جانے کو تیار نہیں"

بالعموم تحصیلدار صاحب کو اس بات کی تاب نہ تھی کہ کوئی شخص انکی رائے کو مسترد کرے۔ لیکن کچھ تو نئی ملاقات کچھ اس شخص کا یقین کا لہجہ، خلاف عادت اس پر فوراً برس نہیں پڑے۔ کبھی کبھی بیہودہ فضول کی بات کو بڑے آدمی طرح بھی دیدیا کرتے ہیں۔ اور حیثیت کا ایک طریقہ یہ بھی تو ہے تاکہ مخالف کو قائل کر دیا جائے تاکہ اس کی زبان بند ہو جائے دھیمے لہجے میں کہنے لگے وہ لہجہ جو شاید ہوشیار بلّی چوہوں کے ساتھ استعمال کرتی ہو۔

"آپ اپنی مرضی کے مالک ہیں۔ میں نے تو دوستانہ طور پر کہا تھا۔ لیکن آپ خدا کے فضل سے پڑھے لکھے قابل آدمی ہیں، ڈاکٹر ہیں۔ ان معاملات کو مجھ سے بہتر سمجھ سکتے ہیں۔ بتائیے تو سہی آپ اس محلے میں رہ کر تندرست کیسے رہیں گے مجھے نہیں معلوم آپ اس نواح سے اچھی طرح واقف ہیں یا نہیں۔ میں خوب جانتا ہوں کہ وہ بیماری کا گھر ہے۔ جو وبا شروع ہوتی ہے اسی جگہ سے شروع ہوتی ہے آپ وہاں رہیں گے تو دوسروں کا علاج کیسا اپنی ہی بیماری سے فرصت نہ ہوگی۔ کیوں

مرزا صاحب وہ کیا شعر ہے مسیحا آپ ہی بیمار ہے؟ مرزا صاحب نے ایک کھسیانے اور معذرتی انداز سے اپنے پان آلودہ دانت ہونٹوں سے باہر نکال دئے) اور پھر یہ کہ شہر میں آپ کی ساکھ کیسے قائم ہوگی۔ آپ پہلے ہی دن سے اپنے گلے میں ایک بھاری پتھر باندھ لیں گے۔ "تیلیوں والے ڈاکٹر" کو کون شریف آدمی بلائے گا؟ جو شخص جیب سے پیسہ خرچ کرتا ہے وہ تو چیز کو دیکھ بھال کر لیتا ہے۔ ممکن ہے آپ بہت قابل ڈاکٹر ہوں لیکن آپ کے خریدار تو اپنی پوزیشن کا خیال کرکے کام کرینگے۔ معاف کیجیے گا انھیں آپ میں سے تیل کی بو آئیگی دیکھئے میں تو آپ ہی کے نفع کی بات کہتا ہوں۔ شروع میں تھوڑا بہت خرچ زیادہ ہوجائے تو اس کی پروا نہیں کرنی چاہیئے۔ بڑی بات ہوا باندھنا ہے اگر ابتدا ہی سے آپ ذرا شان سے رہیں گے اور بڑے لوگوں سے ملیں جلیں گے تو آپ کی چاندی ہے۔ پہلا اثر دیرپا ہوتا ہے یہ تو گویا روپیہ سود پر لگاتا ہے۔ اس کی آمدنی آپ ہمیشہ کھائیں گے"!

تحصیلدار صاحب نے اپنے زورِ بیان پہ مطمئن ہو کر ڈاکٹر کی طرف دیکھا گویا کہو اب کیا کہتے ہو اب بھی یارائے دم زدن ہے؟ لیکن اس مردِ معقول نے خوف یا رعب میں آنا سیکھا ہی نہ تھا۔ شاید کبھی اس کی انّا نے بھی بچپن میں بیجا کے قصے سنا کر نہ ڈرایا تھا! اس کے چہرے پر کچھ غصہ تھا، کچھ حیرانی، کچھ افسوس۔ لیکن اس نے آواز کو قابو میں کرکے نہایت سرد مہری سے جواب دیا

اس کا ایک ایک لفظ تلوار کی طرح تیز تھا، جیسے کسی نرم اور ناپاک چیز کو کاٹ رہا ہو اور اس کی آنکھیں حسب عادت مخاطب کی آنکھوں میں گڑی ہوئی تھیں:۔

"میری عادت بحث کرنے کی نہیں۔ آپ خود ہی بھڑوں کے چھتے کو چھیڑتے ہیں۔ تیلیوں کا ڈاکٹر ہونے میں کیا حرج ہے؟ آخر وہ بھی انسان ہیں انھیں بھی ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔ میں بڑے مکان میں رہکر اور بڑے آدمیوں کو سلام کرکے شہرت حاصل کرنا نہیں چاہتا۔ اس سے کچھ میری قابلیت میں اضافہ نہ ہوگا؟ ڈاکٹر کا کام علاج کرنا ہے، اگر میں علاج اچھا کروں گا تو لوگ مجھے خود بخود بلائیں گے ہاں اگر وہ بیماری یا موت کو نبیل کی بو پر ترجیح دیں تو وہ جانیں انکا کام۔ رہی محلہ کی گندگی اور آب و ہوا کی خرابی، سو اگر ایسی جگہ ڈاکٹر جاکر نہ رہیگا تو کون رہے گا؟ ضلع کے حاکم یا رئیس تو وہاں سکونت اختیار کرنے سے رہے؟ ڈاکٹر کا فرض ہے کہ وہ اپنے مریضوں کی بود و باش اور حالات کا مطالعہ کرے چنانچہ میں اسی قصد سے وہاں جاکر رہا ہوں کہ ان حالات کا اچھی طرح تجربہ کروں اور اپنے مقدور بھر ان کی اصلاح کی کوشش کروں۔"

"آہا معاف کیجئے گا۔ آپ ریفارمر ہیں۔ مجھے یہ معلوم نہ تھا۔ بسم اللہ آپ شوق سے اس غلیظ خرابہ میں جاکر رہیں مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں سب کچھ سمجھ گیا۔"

"آپ کچھ نہیں سمجھے! آپ نے "ریفارمر" کہکر گویا مجھے ذی ہوش

انسانوں کی صف سے باہر نکال دیا۔ عقل اور تجربے کی بلندی سے آپ میری حماقت کا مضحکہ اڑا سکتے ہیں لیکن آپ کو کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ ہر ایماندار ڈاکٹر کی طرح ہر ایماندار افسر کا فرض بھی یہی ہے کہ وہ ریفارمر بنے۔ ڈاکٹر کو ہر انسان کے اندر کم از کم بیشتر انسانوں کے اندر جراثیم اور ان کے پیدا کئے ہوئے امراض اس طرح چلتے پھرتے نظر آتے ہیں گویا وہ شیشے کی کھڑکیوں میں سے کسی دوکان کا سامان دیکھ رہا ہے اور جو شخص ہر طرف دُکھ، مرض، تکلیف، جہالت اور بے حسی دیکھے گا وہ یا تو دل پر چوٹ کھا کر ریفارمر بن جائے گا یا سمجھ لیجئے کہ وہ نظر اور احساس اور ہمدردی سے بالکل عاری ہے۔ اس کی آنکھیں اور دل دونوں پتھر کے ہیں۔ یہی حال ایک پبلک افسر کا ہونا چاہیئے۔ اسے بھی اپنے چاروں طرف لوگوں کی زندگی میں افلاس، بیماری، بدنصیبی اور جہالت کے کرشمے نظر آئیں گے اگر وہ انسان ہے تو ان کی اصلاح کی کوشش کریگا، اگر سنگ دل اور مردم بیزار ہے تو اپنی ناکارہ جان کو بچا کر دوسروں پر ہنسے گا۔ مگر معاف کیجئے میں خواہ مخواہ آپ کی سمع خراشی کر رہا ہوں"۔

"آپ بیشک سمع خراشی کر رہے ہیں۔ میں احمق اور ناتجربہ کار نوجوانوں سے نصیحتیں سُننے کا عادی نہیں۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ میرے فرائض کیا ہیں اور خدا کا شکر ہے کہ میں ان کو اچھی طرح انجام دیتا ہوں۔ رعایا

اور سرکار دونوں مجھ سے خوش ہیں جس روز اپنے جنون آمیز خیالات پر کاربند ہو کر آپ میری جتنی کامیابی حاصل کر لیں گے اس روز آپ مجھے آ کر سمجھائیے گا کہ حاکم کے کیا فرائض ہیں اور میں آپ کو جھک کر سلام کروں گا اس وقت تک آپ انھیں اپنے تک محفوظ رکھئے۔ خدا حافظ!"

اور نوجوان ڈاکٹر اپنے نیچے کے ہونٹ کو دانتوں سے دبائے اور پیشانی پر چینِ فکر ڈالے میدانِ جنگ سے واپس ہو گیا۔ یہ تھی اس کی پہلی لڑائی! جی ہاں، اس میں کیا شک ہے میدان تحصیلدار کے ہاتھ رہا۔ تجربہ اور پرانے جیاول ان کا مقابلہ کون کرے؟

دوسرے روز سے ڈاکٹر علی حسین نے شہر کے پبلک اسپتال میں جانا شروع کر دیا۔ ڈاکٹر بشن چند نے ان کا کچھ لوگوں سے تعارف کرایا اور کچھ مریضوں کی دیکھ بھال اور نسخے لکھنا اور وارڈ کے مریضوں کا معائنہ ان کے سپرد کر دیا پہلے ہی دن مریضوں سے فارغ ہو کر انھوں نے وارڈ کا چکر لگایا اور ــــ اچھا آپ ہی بتائیے کیا دیکھا؟ صفائی محض برائے نام یعنی روزانہ ایک رسم پوری ہوتی تھی لیکن مکڑیوں اور مکھیوں اور بستروں کے نیچے کے کوڑے کو دور کرنے کا انتظام نہ تھا۔ غریب مریضوں کی دوا اور خوراک میں کوئی پابندی یا باقاعدگی نہ تھی۔ کسی کام کا وقت مقرر نہ تھا جب کبھی ڈاکٹر صاحب یا ان کے کسی نائب کو فرصت ہوئی انھوں نے ایک سرسری سا چکر لگا لیا

اور خانہ پری کردی اور بس! معلوم نہیں گاؤں کے سارے گنوار کیوں اس اسپتال میں آکر جمع ہو جاتے ہیں؟ جیسے درخت سے ٹپک پڑتے ہوں۔ نہ ان کے کوئی عزیز ہیں نہ پوچھنے والے اس طرح چلے آتے ہیں جیسے ان کا یہی گھر ہو اور یہاں رہتے ہیں، یہاں تک کہ اتفاقاً صحت ہو جائے اور چلے جائیں یا کمپونڈر وغیرہ ڈانٹ کر نکال دیں کہ کوئی دوسرا شخص اس بستر پر دراز ہو جائے، دوسرا شخص جوان کی بھٹی گرم کر سکے۔ یا موت اسپتال کو ان سے اور انھیں خود سے چھٹکارا دے۔ انھوں نے چند مریضوں سے کچھ دیر بات چیت کی اور ان کا حال پوچھا تو وہ بیچارے حیران ہوئے کہ یہ کیا غیر معمولی بات ہے۔ نسخے دیکھے تو سب بے پروائی سے لکھے ہوئے۔ بعض کی تشخیص ابتدا ہی سے غلط تھی اور بعض کی ابتدا میں صحیح تھی لیکن چونکہ کسی نے پہلے دن کے بعد بیماری کی نشو ونما اور تبدیلیوں پر غور نہیں کیا تھا اس لئے وہ نسخے بقول شخصے سانپ گئے پیچھے لکیر کو پیٹا رہے تھے لیکن دوائیں پینا اسپتال کے معمول میں شامل ہے۔ لہذا انھیں فضول یا نقصان دہ دواؤں کی بدولت مریض اپنے دل کو تسلی دے لیتے تھے اور اسپتال کے سٹاف کا ضمیر مطمئن رہتا تھا۔ علی حسین کی طبیعت میں کرید کا مادّہ تھا۔ وہ ہر چیز کی تہہ کو پہنچنا چاہتا تھا۔ ہر قسم کی سستی، کاہلی، ٹال مٹول، کام سے غفلت اس کے دل میں اس طرح چبھتی تھی جیسے اس کا کوئی بہت بڑا

ذاتی نقصان ہو۔

اس نے پہلے ہی تین چار روز میں یہ سب باتیں دیکھیں اور اسے تعجب ہوا، دیکھیں اور وہ کڑھا، دیکھیں اور اس کو غصہ آیا لیکن بجائے شور و غل مچانے کے اس نے استقلال سے دانتوں کو بھینچکر اپنے دل میں کہا۔ ”اگر مجھ میں کچھ بھی قوت اور صلاحیت ہے تو کسی نہ کسی طرح یہاں کی کایا پلٹ کردونگا۔..... اس نے از خود ڈاکٹر بشن چندر سے کچھ نہیں کہا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یہ دوسرے کا کام ہے جس میں مداخلت کرنے کا اسے کوئی حق نہیں خواہ وہ مداخلت اسی کے فائدے کے لئے کیوں نہ ہو۔ آج کل تہذیب اور آزادی دونوں کا تقاضا یہی ہے نا، کہ ہر شخص اپنی اپنی جگہ خود مختار ہے۔ کوئی شخص کسی دوسرے کا رکھوالا نہیں۔ ہر شخص کو اختیار ہے کہ وہ جس راہ سے چاہے جہنم کو جائے؟ البتہ اس نے دو ایک مرتبہ معائنہ کے دوران میں اسپتال کے ملازموں اور دوا پلانے والے کمپونڈر کو ضرور ٹوکا۔ آخر کیا کرتا آنکھوں دیکھے مکھی نگلنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ لیکن ان مرنجان مرنج لوگوں کو اس بات کی عادت نہ تھی کہ کوئی ان کے کام میں روک ٹوک کرے ان کے افسر اعلیٰ خود آرام طلب واقع ہوئے تھے اور ان کے نزدیک یہ بہتر تھا کہ مریض مر جائے بہ نسبت اس کے کہ کام کرنے والوں میں کوئی رنجش یا بدمزگی ہو اور ایک دوسرے پر اعتراض کرنے کی نوبت آئے۔ پھر ایک

مشکل یہ بھی تو ہے کہ جو شخص خود کمر باندھکر مزدوروں کی طرح دوسروں سے دو چند کام کرنے کو تیار نہ ہو وہ اپنے ماتحتوں سے کام نہیں لے سکتا۔ ڈاکٹر علی حسین اس معاملے میں مزدور مزاج تھا اور ڈاکٹر بشن چند رئیس مزاج۔ طبیعتوں کا ملنا معلوم۔ اس پر طرّہ یہ کہ انھیں ماتحتوں نے نووارد ڈاکٹر کے خلاف ایک کی دس دس لگائیں۔ دخل در معقولات، نکتہ چینی، بربینی کی شکایت کی۔ مقابلے کے طور پر اپنے ڈاکٹر صاحب کی خوش خوئی اور صلح جوئی کی تعریفیں کیں۔ نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا یعنی ان کے احساسِ خودی کو تقویت پہنچی۔ مقابل کی کمزوری اور بیوقوفی کا احساس ہوا اور بغیر کسی ذاتی تحقیق و تفتیش کے علی حسین سے بدظن ہو گئے پھر جلد ہی اس نے خود انھیں اپنے خلاف رائے قائم کرنے کا موقع دیدیا اور بدظنی مخالفت میں تبدیل ہو گئی۔ آدمی کا دشمن خود اس سے بڑھکر اور کون ہوتا ہے؟ اور اس مصلحت ناشناس آدمی میں یہ کمال تھا کہ جہاں موقع ملا اپنے پاؤں میں کلہاڑی مار لی۔ ابھی تحصیلدار صاحب کو ناراض کیا تھا یعنی مگر مچھ سے بیر مول لیا تھا اور چند ہی روز بعد مچھلیوں کے سرگروہ سرکاری ڈاکٹر کی دکھتی ہوئی رگ کو چھیڑ دیا۔ کیسے؟ وہ بدظن تو ہو ہی چکے تھے ایک دن پوچھ بیٹھے: کہئے نمبر ۱۲ کا کیا حال ہے (نمبر ۱۲۔ ایک بوڑھا کسان تھا جو اسپتال میں دو ہفتے سے پڑا ہوا تھا اور بطور ملیریا کے مریض کے کونین کے

ذریعہ تلخی کام و دہن کی آزمائش کر رہا تھا)، اس کو بخار ہے یا اُتر گیا؟ علی حسین نے کہا بخار اُترنے کی فی الحال کوئی امید نہیں مجھے اس کی حالت قابل اطمینان معلوم نہیں ہوتی، کیوں؟ کیا آپ سے ملیریا کا علاج بھی نہیں ہوتا؟" اس نے آنکھیں اُٹھا کر ان کو غور سے دیکھا اور کہا کہ "ملیریا کا علاج تو مجھ سے پہلے ہو رہا تھا میں تو اصلی مرض کا علاج کر رہا ہوں۔ اس کے دونوں پھیپڑوں میں پانی اُتر آیا ہے۔ اس کی حالت اب تک سنبھل جاتی لیکن ابتدا میں کھانے پینے کا ٹھیک پرہیز ہوا، نہ نقل و حرکت کی احتیاط کی گئی اس لئے کچھ پیچیدگیاں پیدا ہوگئی ہیں۔" برس پڑے اور کیوں نہ برستے؟ کیا احسان شناسی اسی کو کہتے ہیں۔ انھوں نے تو محض انسانی ہمدردی میں اسے کام کرنے کا موقع دیا تھا اور اس نے نکتہ چینی اور اعتراض شروع کر دیا۔ اچھا دستور ہے۔ جس ہانڈی میں کھاؤ اسی میں چھید کرو! بولے "آپکو کیسے معلوم اسے کیا شکایت ہے۔ میں نے سات آٹھ دن ہوئے دیکھا تھا معمولی بخار تھا اور آپ کو جمعہ جمعہ آٹھ دن کالج سے نکلے ہوئے گزرے اور آپ نے ایک نظر میں اس کی بیماری بھانپ لی اور بغیر میری اجازت کے علاج تبدیل کر دیا اور اپنی ناکامی کا سبب یہ قرار دیا کہ مریض کی نگہداشت ٹھیک نہیں ہوئی۔ خوب ڈاکٹر صاحب، ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ اسپتال کی ہر چیز پر ناک چڑھاتے ہیں۔ یہاں نہ

غذا ٹھیک ہے نہ علاج نہ دیکھ بھال، آپ سمجھتے ہوں گے کہ مجھے کچھ خبر ہی نہیں۔ آخر میں جو یہاں بیٹھا ہوا اتنا بڑا اسپتال چلا رہا ہوں اور سارے شہر کی صحت اور بیماری کا انتظام کرتا ہوں تو مجھ میں بھی تھوڑی سی عقل اور سمجھ ہونی چاہیئے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ مجھے بدنام کرکے....

ڈاکٹر علی حسین نے ان کو روک کر کہا معاف کیجئے میرا ہرگز یہ منشاء نہیں نہ کبھی ہوگا کہ آپ کو بدنام کروں۔ مجھے آپ کو بدنام کرنے سے کیا حاصل۔ میں تو محض آپ کے سوال کا صاف صاف جواب دے رہا تھا۔ یہ واقعہ ہے کہ اس بیچارے کو پسلی کا ورم ہے اور یہ بھی واقعہ ہے کہ اس کی غذا دوا کا بندوبست نہایت خراب تھا۔ روزانہ چارٹ بھی باقاعدہ نہیں بھرا گیا۔ میں نے یہ سب باتیں دیکھی تھیں۔ کیونکہ آپ نے میرے سپرد یہ کام کیا تھا اور میرا خیال تھا اور اب بھی ہے کہ آپ کو ان باتوں کی اطلاع کرنا میرا فرض ہے۔ آپ نے پوچھا میں نے بتا دیا آپ نے مجھے یہاں کام کرنے کا موقع دیا۔ میں اس کا بہت شکر گزار ہوں۔ آپ کی مخالفت کیسے کرسکتا ہوں؟ البتہ مجھ سے یہ ممکن نہیں کہ میں سچی بات کو ظاہر نہ کروں خواہ وہ میرے خلاف ہو یا آپ کے یا کسی اور کے۔ اس پر تو آپ کو اعتراض نہ ہوگا،، لیکن ڈاکٹر صاحب ان تنگ دل لوگوں میں سے تھے جن کو دنیا کی ہر چیز اپنی ذات

کے آئینہ میں دکھائی دیتی ہے۔ وہ اصولی اعتراض اور ذاتی اعتراض میں تمیز نہ کر سکتے تھے۔ ان کے نزدیک اختلاف رائے ایک سنگین جرم تھا اور گستاخی۔ وہ اس نکتہ کو کیسے سمجھتے کہ اسپتال کے خراب انتظام پر نکتہ چینی کرنا یا اس کی اصلاح کی کوشش ان کی ذات اور خاندان اور روزی کی مخالفت نہیں؟ چنانچہ اُنھوں نے ڈاکٹر علی حسین کو اس اعزازی خدمت سے چُھٹی دی اور وہ اسپتال سے فراغت پا کر اپنے گھر آ بیٹھے اور رات کو یہ سوچتے ہوئے سو گئے کہ اس رفتار سے تمام شہر کو ان کا مخالف بننے کتنی دیر لگے گی۔ اس تھوڑے سے عرصے میں انھیں شہر کے جسم میں جگہ جگہ زخم اور پھوڑے پھنسیاں نظر آنے لگیں تھیں لیکن یہ یقین بھی ہو چلا تھا کہ وہ جس زخم پر ہاتھ رکھیں گے کسی نہ کسی کو ناراض کریں گے۔ کیونکہ کوئی شریف آدمی اس بات کو گوارا نہیں کرتا کہ راہ چلتے اس کے ناسور کو دیکھیں۔ اگر کوئی بے وقوف منچلا اس پر سے کپڑا ہٹانا چاہے تو مُنھ کی کھائے گا۔ اب کیا کیا جائے؟ اپنی ذات کی حفاظت مقدم ہے یا حق گوئی کی رُسوائی اور خطرہ برداشت کرنا؟

(۳)

کام شروع کئے اسے کئی ہفتے ہو گئے۔ ابتدائی تلخ تجربوں کے

بعد اس نے نہ کسی بڑے آدمی سے جاکر ملاقات کی، نہ اپنا کاروبار بڑھانے کے لئے ڈاکٹروں کے معمولی طریقے اختیار کئے بلکہ روزمرّہ جو مریض آجاتے اُنھیں پر قناعت کرتا۔ اسے اپنے نفع نقصان کی تمیز کم تھی۔ کوئی فیس دیدیتا تو لے لیتا۔ نہ دیتا تو اس سے مانگتا نہیں تھا۔ کیوں کہ اس کے دماغ میں کسی طرح یہ خیال جاگزیں ہو گیا تھا کہ ڈاکٹری کا پیشہ خدمت خلق کے لیے ہے روپیہ کمانے کے لیئے نہیں ہے اور چوں کہ اس کے مریض تقریباً سب کے سب غریب مزدوری پیشہ لوگ تھے اس لئے ”خدمت خلق“ کا مادّی معاوضہ بہت ہی کم ملتا تھا۔ شہر میں چند دولت مند بھی تھے لیکن وہ اس کو جانتے نہ تھے اگر کسی نے تذکرہ بھی سُنا تھا تو اس تمہید سے کہ ایک خبطی ڈاکٹر تیلیوں کے محلّے میں آکر رہا ہے۔ چنانچہ ابتدا میں ان کے پاس مریض کم آتے اور جو آتے وہ سب نادار۔ لیکن اس کا اصول یہ تھا اور اصول عادت میں تبدیل ہو گیا تھا کہ وہ بلا استثنا ہر مریض کو نہایت غور سے، نہایت توجہ سے، نہایت اطمینان سے دیکھتا اور اس کا حال تفصیل سے سُنتا۔ نہ صرف اس وجہ سے کہ مریض کو ڈاکٹر کے سامنے گفتگو کرنے سے تسکین ہوتی ہے۔ بلکہ اس لئے کہ اس کی دُکھ بھری بپتا میں اس کی مایوسانہ شکایتوں میں اسے بعض اوقات بہت مفید اور قیمتی اشارات مل جاتے تھے۔ وہ خود اس سے کرید کرید کر سوالات پوچھتا اور سوالات بھی ایسے ہی نہیں جن کا تعلق براہ راست اس کی بیماری سے ہو،

ایسے بھی جو بظاہر بے تعلق اور بے کار معلوم ہوں : تم کیا کام کرتے ہو، کس محلہ میں رہتے ہو۔ مکان میں کتنے آدمی ہیں۔ پڑوسی کس قسم کے لوگ ہیں۔ کبھی سفر بھی کرتے ہو یا نہیں۔ ایک دفعہ کوئی بوڑھا کاشتکار اس کے پاس علاج کے لئے گیا۔ اس سے بھی اسی قسم کے اناپ شناپ سوال کر ڈالے۔ اس نے کہا "آدمی ذرا تجربہ کار اور سمجھدار تھا، اس میں وہ سمجھ بھی جو انسانوں سے ملنے جلنے، اپنا کام دل لگا کر کرنے اور آنکھیں کھول کر زندگی بسر کرنے سے آجاتی ہے" اس نے کہا۔ ڈاکٹر صاحب یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ تم یہ ساری باتیں کیوں پوچھتے ہو میں نے تمھیں اپنی تکلیف کا حال تو بتا دیا۔ اب تمھیں اس سے کیا غرض کہ میرے کتنے بال بچے ہیں، بیل گھر میں باندھتا ہوں یا باہر، روپیہ کتنے سود پر لیا ہے۔ زمین اپنی بوتا ہوں یا کسی دوسرے کی ؟ ڈاکٹر نے خفیف سی مسکراہٹ سے جواب دیا۔

"بڑے میاں میرے سوالوں کا بُرا نہ مانو۔ میری عادت یہ ہے کہ میں بات کی تہ تک پہنچنا چاہتا ہوں۔ اب تم نے مجھ سے آکر کہا کہ مجھے دمہ کی شکایت ہے اور رات کو نیند نہیں آتی۔ اس کا علاج تو یہ ہے کہ میں تمھیں کوئی ایسی دوا دیدوں جو رات کو آرام سے سُلا دے۔ اس طرح تمھیں عارضی افاقہ ہو جائے گا اور میں تمھیں دھوکہ دیدوں گا۔ لیکن اس سے بیماری کی جڑ دور نہیں ہو گی۔ مجھے یہ فکر ہے کہ تمھاری بیماری کی اصلی"

گہری چھپی ہوئی وجہ معلوم کروں۔ بہت سی بیماریاں آدمی کے جسم میں نہیں ہوتیں۔ اس کے دل میں یا دماغ میں ہوتی ہیں۔ لیکن ان کا نزلہ جسم پر گرتا ہے۔ تم میری بات سمجھ گئے نا" بوڑھا کاشتکار بہت غور سے سن رہا تھا اس لئے کہا۔ ہاں میں کچھ کچھ تو سمجھا مگر پوری طرح عقل میں نہیں آیا کہ دماغ کی بیماری کیسی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر کا ایک نظریہ یہ تھا کہ عام لوگ جنھیں ہم بے وقوف اور جاہل سمجھتے ہیں دراصل خاصے سمجھدار ہوتے ہیں۔ اگر انھیں بات اچھی طرح سمجھائی جائے۔ وہ اس بات کا قائل نہیں تھا کہ مفید اور ضروری معلومات کو اصطلاحوں اور جادو کے سے منتروں میں چھپا کر رکھا جائے۔ چنانچہ اس لئے جواب دیا "میرا مطلب یہ ہے کہ اکثر انسان کو کسی قسم کی پریشانی یا خوف لاحق ہوتا ہے مثلاً قرض کا ڈر سر پر سوار ہے یا دل پر کسی گناہ یا غلطی کا بوجھ ہے۔ فرض کرو تم کسی کی زمین دبالو اور تمھارا من تمھیں بُرا کہے کہ یہ بڑی ناانصافی اور ظلم کی بات ہے تو جب تک وہ ڈر یا دل کی چبھن باقی ہے تم خوش اور مطمئن نہیں رہ سکتے۔ اگر فکر زیادہ سخت ہے تو ممکن ہے تمھیں بخار آجائے یا رات کی نیند اڑ جائے یا حافظہ خراب ہوجائے۔ ممکن ہے ڈاکٹر دیکھے تو کہے کہ تمھارے بدن میں کوئی خرابی نہیں۔ لیکن دراصل بہت بڑی خرابی ہے یعنی تمھارے دل دماغ اور جسم میں صلح نہیں رہی اور جب یہ صلح ٹوٹ جاتی ہے آدمی پر طرح طرح کی بیماریاں لاحق ہونے لگتی

ہیں۔ تم نے دیکھا ہو گا کہ بعض عورتوں کو گھبراہٹ اور "ہول دلی" کا مرض ہو جاتا ہے۔ یہ بھی اسی قسم کی چیز ہے۔ نبض ٹھیک، حرارت ٹھیک، معدہ ٹھیک، جگر اور پھیپھڑے صاف لیکن وہ بیچاری سو مریضوں کی مریض۔ اس کا علاج محض دوا سے نہیں ہوتا۔ مریض کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اس کے دکھ درد کو اپنا درد دکھ بنانے کی ضرورت ہے اسی لئے میں یہ ساری اِدھر اُدھر کی باتیں پوچھا کرتا ہوں تاکہ میں اسے اپنا دوست بنا لوں اور بیماری کی جڑ کو تلاش کر سکوں۔" بڑے میاں نے سر ہلا کر کہا "ہاں ڈاکٹر صاحب، اب میں سمجھا۔ تم فقط بیماری کو نہیں دیکھتے آدمی کو بھی دیکھتے ہو اور آدمی کا ہی علاج کرنا چاہتے ہو۔ بات تو دل لگتی ہے۔"

بڑے میاں نے بات پتے کی کہی تھی ڈاکٹر کے علاج کے اصول کو اس نے بھانپ لیا تھا۔ اسے بیماری سے زیادہ بیماروں سے دلچسپی تھی۔ ہر بیمار اس کے نزدیک ایک بالکل نیا اور نرالا مسئلہ تھا جس کو حل کرنے کے لئے علاوہ ڈاکٹری جاننے کے بے انتہا صبر، محنت اور ہمدردی کی ضرورت تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح مریض کے دل کے اندر گھس جائے اور دیکھے کہ اس کے جسم اور روح میں کونسی جسمانی اور نفسی خرابیاں ایسی ہیں جو اسے بے چین رکھتی ہیں۔ وہ ان ڈاکٹروں میں سے نہیں تھا جو انسانوں کی تقسیم امراض اور ادویہ کی بنا پر کرتے ہیں۔ ایک کی نبض پر ہاتھ رکھا اور

"ملیریا، مکسچر نمبر ۱" دوسرے کی زبان دیکھی "قبض میگنیشیم سلفیٹ" تیسرا "کھانسی سیرپ تولو" بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص کا حال پوچھ رہے ہیں دوسرے کی نبض پر ہاتھ ہے اور تیسرے کا نسخہ محرر یا شاگرد کو لکھایا جا رہا ہے۔ علی حسین مریضوں پر وقت صرف کرتا تھا۔ جی ہاں درست ہے۔ جب مریض کم ہونگے تو اور کیا کریگا! اور ان کا بے ترتیب اور تفصیلی حال سُن کر ان سے طرح طرح کے سوال پوچھنا اور جوابوں کو غور سے سننا اور کبھی کبھی اسے ایسا معلوم ہوتا گویا گھپ اندھیرے میں ٹٹولتے ہوئے دفعۃً اس کی آنکھوں کے سامنے ایک بجلی چمک گئی ہے جس نے کم از کم ایک سکنڈ کے لئے سب چیزوں کو بالکل واضح کر کے دکھا دیا ہے۔ اسے مرض سے جنگ کرنے میں وہی لطف آتا تھا جو ایک ماہر جاسوس کو کسی نہایت ہوشیار اور پوشیدہ مجرم کے تلاش کرنے میں، اور کامیابی سے ایسی خوشی ہوتی تھی جیسی کسی آرٹسٹ کو اپنے خیال کے مطابق ایک حسین تصویر کے مکمّل کرنے میں۔ اس کا معمول یہ تھا کہ دن کا بیشتر حصّہ مریضوں کو دیکھنے میں صرف کرنا اور رات کے وقت اپنی مفلسی، دُنیا کی بے اعتنائی اور تمام دوسرے دھندوں کو بھول کر ڈاکٹری کی کتابوں اور نفسیات خصوصاً تحلیل نفسی کی تازہ ترین تصانیف کا مطالعہ کیا کرتا جو وہ کہیں باہر کی لائبریری سے منگاتا تھا۔ اس کو کالج کے زمانے سے نفسیات کے مطالعہ کا

شوق تھا اور اس نے گزشتہ پانچ چھ سال میں بچّوں اور نوجوانوں، مردوں اور عورتوں، مجرموں اور مجنونوں غرض ہر قسم کے لوگوں کا نفسی مطالعہ کتابوں کے واسطے سے کیا تھا۔ کیوں کہ اس کا یہ عقیدہ تھا کہ کوئی ڈاکٹر اُس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتا۔ جب تک وہ اپنے مریضوں کی نفسی حالت اور کیفیات کا اندازہ نہ لگا سکے اور ان کا مطلب نہ سمجھ سکے اس کی تمام فرصت اپنا علم اور واقفیت بڑھانے میں گزرتی تھی کیوں کہ وہ یہ محسوس کرتا تھا کہ میں ایک بہت بڑے جہاد کے لیئے تیاری کر رہا ہوں جس میں نہایت مہیب اور خطرناک قوّتوں کا مقابلہ کرنا ہے۔ ان کو زیر کرنے کے لیئے جس قدر قابلیت اور علم حاصل کیا جائے کم ہے۔ لیکن جوں جوں اس کی نظر وسیع اور گہری ہوتی جاتی تھی اور وہ انسانی امراض کی حقیقت کو بہتر سمجھتا تھا اس کے دل میں رحم اور ہمدردی، اتھاہ رحم اور اتھاہ ہمدردی پیدا ہوتی جاتی تھی کیوں کہ وہ گویا اپنی آنکھوں سے دیکھتا تھا کہ کمزور انسان کیسی کیسی خوفناک اور دُکھ پہنچانے والی طاقتوں کے نرغے میں گھرا ہوا ہے اور اس خیال سے کسی دل والے انسان کو کیا تسکین ہوسکتی ہے کہ ان میں سے بہت سی مصیبتیں اور آفتیں خود اس کے اپنے ہاتھ کی، اس کی جہالت اور تنگ نظری اور تعصب کی پیدا کی ہوئی ہیں؟ مگر جب مریض اس کے روبرو ہوتا تو وہ اپنا نظری مطالعہ گویا

باکل بھول جاتا اور ہمہ تن اس شخص میں محو ہو جاتا۔ اس کا وسیع علم ایک پوشیدہ مشعل کی طرح چاروں طرف روشنی ضرور ڈالتا تھا لیکن اسکی آنکھوں کے سامنے اس طرح نہیں چمکتا تھا کہ نظر کو خیرہ کردے اور بجائے روشنی میں ہر چیز میں نظر آنے کے صرف روشنی ہی دکھائی دے۔ وہ انسان کو مقدم سمجھتا تھا اور ڈاکٹری کی قابلیت کو موخر۔ خواہ مخواہ انسانوں کی تقسیم جانی بوجھی بیماریوں کے لحاظ سے نہ کرتا۔ بلکہ سمجھ اور ہمدردی کو اپنا راہبر بنا کر مریض کا مطالعہ غور سے کرتا۔ اسے یہ پروا نہیں تھی کہ سچ اور اصلیت کی تلاش اسے کہاں لے جائے گی۔ اس کے نزدیک جسم اور دماغ طب اور نفسیات میں کوئی مستقل فصل نہ تھا، کوئی سنگین دیواریں حائل نہ تھیں جن پر سے کودنا جرم ہو۔ انسان ایک نہایت پیچیدہ، نہایت مبہم، نہایت نازک ہستی ہے اور قابل سے قابل ڈاکٹر بھی اکثر لاعلمی کے دھندلکے میں اٹکل پچو کام کرتا ہے۔ ایسی حالت میں کہاں تک جائز ہے کہ کوئی شخص آنکھوں پر اندھیریاں لگائے کہدے کہ میں سامنے کی روشنی میں کام کرونگا، دائیں بائیں کی روشنی کو بند کردونگا۔ روشنی جدھر سے آئے اچھی ہے، حقیقت کے چہرے کو روشن کرتی ہے۔ ڈاکٹر ہے تو کیا؟ علاج تو انسانوں کا کرنا ہے جن کی ذات کو قدرت نے علیحدہ علیحدہ خانوں میں تقسیم نہیں کیا۔ ہر اثر جو انسان پر پڑتا ہے پانی کی لہر کی طرح

ہے جو اُٹھتی ہے اور چشم زدن میں کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے ۔۔۔۔۔

(اچھا ڈاکٹر، تم ایسے ہی انوکھے خیالات میں دبے رہو۔ تمہیں ابھی معلوم نہیں کہ زندگی میں ہر کھیل، ہر کام، ہر پیشے کے قاعدے ہوتے ہیں۔ کھلاڑی کا فائدہ اسی میں ہے کہ ان قاعدوں کی پابندی کرے۔ نہیں کرے گا تو باقی سب کھلاڑی اس کے خلاف ہو جائیں گے اور اسے میدان سے نکال دینگے۔ پھر کیا کرو گے ڈاکٹر؟)

خیر وہ منزل تو ابھی دُور ہے۔ فی الحال تو ڈاکٹر نے اپنا معمول یہ کر لیا ہے کہ ہر مریض کا علاج ایسی تندہی سے کرتا ہے کہ گویا اس کا تمام مستقبل اسی علاج پر منحصر ہے۔ حالانکہ ان میں سے بعض غریب اور جاہل لوگ زبان سے شکریہ ادا کرنا بھی نہیں جانتے۔ لیکن اس طرح خود کو تج کر کام کرنے کی دو وجہیں ہیں۔ اول تو ڈاکٹر کا یہ ایمان کہ کوشش کر کے دُکھ کا مداوا کرنا ڈاکٹر کے لئے ایسا ہی ضروری ہے جیسے کسی جاندار کا ہوا میں سانس لینا۔ یہی اس کی زندگی کا مقصد ہے اسی میں لطف ہے، اسی میں مسرّت، اسی میں کامرانی۔ دوسرے یہ احساس کہ اسے کسی بڑے معرکۃ الآرا مستقبل کے لئے تیاری کرنی ہے۔ اس کے نزدیک ہر مریض نہ صرف اس کا ایک ہم جنس تھا جس کے ساتھ اسے پوری پوری ہمدردی اور کوشش کرنی چاہیئے بلکہ وہ اس کے دماغ کے اوزاروں کو تیز اور اس کی تشخیص اور تجربے کو

زیادہ صحیح اور کارگر کرنے کا آلہ بھی ہے جو مریض آئے اللہ کا نام لے کر اس کو اس طرح پڑھنے کی کوشش کر ڈالو جس طرح کوئی کھلی ہوئی کتاب پڑھتا ہے کیوں کہ آئندہ بہت سی مشکل اور دقیق کتابیں پڑھنی ہیں ..... اس محنت اور جانفشانی کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ اپنے محلے میں اور کہیں کہیں باہر بھی اس کی ساکھ بیٹھنے لگی، اس نے جتنے علاج ہاتھ میں لئے اکثر میں کامیابی ہوئی۔ خواہ اس کو خلوص کی برکت کہیئے یا نیک نیتی کا فیض یا قابلیت کا ثبوت مگر واقعہ یہ ہے کہ اس نے پہلے چند مہینوں میں کئی معرکے کے علاج کئے۔ ان کی شہرت اخباروں میں تو نہیں ہوئی کیونکہ اخباری شہرت حاصل کرنا ایک مستقل فن ہے جو اس کے نصیب میں نہیں تھا اور جس کی قدر و قیمت سے بھی وہ پوری طرح واقف نہیں تھا۔ لیکن ان غریب لوگوں کے دلوں سے پوچھئے جن کی زندگی کو اس نے دکھ سے سکھ میں تبدیل کر دیا، جن کے بجھتے ہوئے چراغوں میں اس نے دوبارہ مسرت کا تیل ڈال دیا۔ ان کے دلوں پر اس کا سکہ بیٹھ گیا۔ کیونکہ ڈاکٹر کی قابلیت سے زیادہ خلوص اور انسانی ہمدردی ان کو تسخیر کر لیتی ہے اور اس چیز کا تجربہ انھیں پہلے کبھی اس حد تک نہ ہوا تھا۔ چونکہ غریب لوگ جذبات کے اظہار میں کنجوسی نہیں کرتے۔ اس لئے وہ اپنی چوپال اور بیٹھکوں میں اور کبھی کبھی دوسرے شہر والوں کے سامنے اس کے گن گاتے

اور اس طرح اپنی احسان مندی کا اظہار کرتے تھے۔ چنانچہ اسی طریقے سے اسکی شہرت بوڑھے کاشتکار کی معرفت شہر کے ایک بہت بڑے سیٹھ لالہ رام سروپ کے یہاں پہنچ گئی یاد ہوگا کہ اس نے بہ سبیل تذکرہ کہا تھا کہ اکثر بیچاری عورتوں کو ہولؔ دلی کا مرض ہو جاتا ہے اور لوگ اس کی صحیح وجہ نہیں پہچانتے۔ بڑے میاں کے دلکو وہ بات لگی ہوئی تھی۔ ایک روز سیٹھ صاحب اپنی مصیبت کا رونا اس سے رو رہے تھے بیٹی کو کئی سال سے یہ مرض ہو گیا ہے شہر کے اور باہر کے بڑے بڑے ڈاکٹروں کا علاج کیا۔ لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ حالت بد سے بدتر ہوتی جاتی ہے۔ بیس سال کی عمر ہونے آئی شادی بھی نہیں ہوئی جس کی جان کا خطرہ ہو اس کی شادی کیسے کی جائے۔ بڑے میاں کے حافظے نے زور کیا۔ کہنے لگے ”مہاراج، ایک بات تو میں بتاؤں۔ ٹیلیوں والے ڈاکٹر کو بلا کر دکھا دو۔ اگر پر میشور کی مرضی ہے تو اس روگ کی جڑ کاٹ ڈالے گا“ سیٹھ صاحب نے مایوسی سے کہا ”بڑے میاں، ایک سے ایک نامی گرامی حکیم ڈاکٹر کو دکھا لیا کچھ نہیں ہوا۔ گیا سانس واپس نہیں آتا اور ٹوٹی ہوئی آس بندھتی نہیں“ بڑے میاں نے پھر اصرار کیا۔ پوچھا ”وہ ہے کون ڈاکٹر؟ میں نے تو اس کا نام بھی نہیں سنا۔ اناڑی آدمی ہوا تو مرض کو اور بگاڑ دیگا“ مگر بڑے میاں نے ڈاکٹر کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے اور سیٹھ صاحب کو راضی کر لیا۔ ڈاکٹر کی طلبی ہوئی۔ سیٹھ صاحب ان کو دیکھکر ذرا چونکے۔ نوجوان

آدمی، نہ داڑھی کا رعب، نہ کپڑوں کا رعب، نہ لہجے میں حکومت جو اکثر اوقات بڑا کام دے جاتی ہے بشش و پنج میں پوچھ بیٹھے۔

"کہئے ڈاکٹر صاحب، آپ میری لڑکی کا علاج کردیں گے؟" بولے: "آیا تو اسی لیئے ہوں،" دبے وقوف یہ بھی کوئی جواب ہے۔ اس سے کیا اثر ہوگا؟ یہ لوگ زیادہ میٹھی باتوں کے عادی ہیں!) پوچھا:۔ "اچھی ہو جائے گی؟" آپ جانیں سوال مہمل تھا۔ دیکھا نہ بھالا۔ پیشین گوئی کا تقاضا۔ ڈاکٹر کی یہ عادت نہ تھی کہ بے وقوفی کا استقبال خندہ پیشانی سے کرے۔ خواہ بے وقوفی کی پشت پر دولت ہی کیوں نہ ہو۔ نہایت خشک طریقے سے جواب دیا:۔

"اپنی سی کوشش کروں گا وعدہ نہیں کرسکتا۔ بہتر یہ ہے کہ اس بحث میں وقت صرف کرنے کے بجائے مریضہ کو دیکھا جائے۔" سیٹھ صاحب خوشامد اور چکنی چپڑی گفتگو کے عادی تھے۔ اس جواب سے کچھ سٹ پٹا گئے اور فوراً ڈاکٹر کو مریضہ کے کمرے میں پہنچا دیا۔ اس نے تفصیل کے ساتھ حال سُنا اور دیکھا اور بہت سی باتیں پوچھیں جن سے اندازہ ہو جائے کہ لڑکی اور تمام گھر والوں کا روزانہ کیا معمول رہتا ہے اور کیا کیا مشاغل اور دلچسپیاں ہیں۔ اس کے بعد مریضہ سے کہا۔

"سنو، میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تم اچھی ہو جاؤ گی لیکن تم یہ پکا وعدہ کرو کہ جو کچھ میں کہوں گا اُس کا یقین کروگی اور اُس پر عمل کروگی۔" بعض لوگوں کی

گفتگو کا طرز ہی اطمینان اور اعتماد دلانے والا ہوتا ہے۔ لڑکی نے کہا "میں سچے دل سے وعدہ کرتی ہوں"۔ "اچھا۔ پہلی بات یہ ہے کہ تم مطلق بیمار نہیں ہو"۔ اس نے کچھ شک اور تعجب کے انداز سے اور کچھ ٹمٹماتی ہوئی امید کے ساتھ ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔ "دیکھا۔ تم نے اپنا وعدہ توڑ دیا اور میری بات کا یقین نہیں کیا (مسکرا کر) خیر اس دفعہ کی معافی آیندہ ایسا نہو۔ میں نے جو کچھ کہا۔ وہ بالکل صحیح ہے۔ میں نے پوری طرح معائنہ کر لیا ہے۔ تمھارا معدہ، جگر، دل، دماغ، پھیپڑے سب بالکل ٹھیک ہیں۔ اگر تم میری ہدایتوں پر عمل کروگی کھلی ہوا میں رہوگی، باقاعدہ ورزش کا انتظام رکھوگی اور کھانے پینے سونے میں احتیاط کروگی۔ تو تمھاری بیماری کا پتہ بھی نہ چلے گا۔ مگر میں تمھاری مدد کے بغیر کچھ نہیں کرسکتا۔ ہاں اگر تم پکا ارادہ کرلو کہ مجھے اچھا ہونا ہے تو میں بہت جلد تمھاری بیماری کھودوں گا"۔ اس نے شکر گزاری کے لہجے میں اقرار کیا اور یہ سیٹھ صاحب کے پاس پہنچے۔ "میں نے لڑکی کا امتحان کر لیا ہے۔ میں یقیناً اس کا علاج کرسکتا ہوں۔ لیکن میری چند شرطیں ہیں"۔ "ڈاکٹر صاحب، آپ کو منہ مانگی فیس ملے گی۔ میں دولت مند آدمی ہوں۔ مجھے روپیہ کی پروا نہیں"۔ "فیس؟ میں نے فیس کا کب ذکر کیا۔ میں پستول ہاتھ میں لے کر بیماروں کا علاج نہیں کرتا کہ اتنا روپیہ دو۔ نہیں تو میں گولی مارتا ہوں۔ میری شرطیں یہ ہیں کہ۔ لڑکی کو آپ اس کے گھر کے قید خانے سے نکال لئے اور

اس کی ورزش اور ہوا خوری کا انتظام کیجئے۔ اس میں تازہ خون پیدا نہیں ہوتا۔
جو ہر بیماری کی جڑ ہے۔ دوسرے مستقل فائدہ کے لئے اس کی زندگی کو بالکل بدلنے
کی ضرورت ہے جیسے ہی اسکو افاقہ ہو۔ آپ اس کی شادی کر دیجئے"۔ سیٹھ
صاحب بہت چکرائے۔ دونوں شرطیں کڑی اور ان کے لئے ناقابلِ قبول۔
وہ نہایت قدامت پسند آدمی تھے اور عورتوں کے لیے ورزش اور ہوا خوری
کے الفاظ ان کے نزدیک کوئی معنے نہ رکھتے تھے۔ دوسرے گو انھیں لڑکی سے
محبت تو بہت تھی لیکن وہ دراصل اس کی شادی کرنے پر رضامند نہ تھے،
کنجوس کے لئے بیٹی کی شادی اور گھر سے دھن کا نکل جانا ایک مصیبت ہے۔
چنانچہ انھوں نے پہلے تو حکمت عملی سے کام چلانا چاہا، روپیہ کا لالچ دیا، دوسرے
ڈاکٹروں کی نظیریں پیش کیں۔ لیکن جب ڈاکٹر علی حسین پر کوئی اثر نہ ہوا اور
اس نے اپنی شرطوں میں ترمیم نہ کی تو انھوں نے صاف جواب دے دیا "میں
اپنی برادری اور شہر کی رسموں کو توڑنے کے لئے تیار نہیں ہوں آپ کی شرطیں
بھی عجیب ہیں۔ اب تک بیسیوں ڈاکٹروں نے علاج کیا کسی نے ایسے
اچنبھے کی باتیں نہیں کیں۔" "جی ہاں اور کسی نے مریضہ کو اچھا بھی نہیں کیا"
اور یہ کہکر انھوں نے اپنا بیگ سنبھالا اور اس جہالت کدے سے نکل گئے۔۔۔۔۔ ایک
ہفتے کے بعد ہی جب مریضہ کی حالت بہت زیادہ خراب ہوئی تو یہ پھر طلب
کئے گئے۔ شرطیں منظور کی گئیں۔ دو مہینے تک علاج کا سلسلہ چلا اور بغیر بیشمار

دواؤں کے استعمال کے سیٹھ صاحب کی لڑکی دوبارہ زندہ ہوگئی اور ڈاکٹر کو اس کی شادی میں بطور ایک معزز مہمان اور دوست کے بُلایا گیا۔ مگر جب سیٹھ صاحب نے ان کو شکرانے کے طور پر ایک بڑی رقم دینا چاہی تو انھوں نے صاف انکار کر دیا اور بہت اصرار کے بعد صرف اپنی واجبی فیس لی۔ سیٹھ صاحب اسے اپنے عزیزوں کی طرح چاہنے لگے تھے اور انھوں نے اس مغائرت کی شکایت کی تو جواب دیا کہ اول تو عزیزوں سے فیس لینی ہی نہیں چاہیے دوسرے آپ ابھی توقف کریں ممکن ہے مجھے کبھی آیندہ چلکر آپ سے مدد مانگنے کی ضرورت پڑے۔ اُس وقت آپ تلافی کر دیجئے گا۔

۴

دُنیا میں بہت سے لوگ آنکھیں بند کر کے کام کرتے ہیں اور بہت سے لوگ آنکھیں تو کُھلی رکھتے ہیں لیکن ان پر اِدھر اُدھر اندھیریاں چڑھا لیتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ انھیں سوائے اپنی ناک کے سامنے کے اور کوئی چیز نہیں سوجھتی چنانچہ اسی قصبے میں بیسیوں ڈاکٹر رہ چکے تھے اور چند اب بھی موجود تھے۔ وہ مریضوں کا علاج کرتے تھے، جو کبھی خدا کے فضل سے اچھے ہو جاتے تھے اور کبھی اس کی مصلحت سے مر جاتے تھے لیکن ان نیک بندوں نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ شہر میں اتنی زیادہ بیماری کیوں ہے اور بعض خاص بیماریوں کو کیوں اس سے اس درجہ لگاؤ ہے۔ نہ صرف سوچا نہ تھا بلکہ آنکھوں کے معمولی مشاہدے

سے بھی کام نہ لیا تھا۔ علی حسین نے پہلے ہی چند روز میں یہ محسوس کیا تھا کہ شہر میں صفائی اور حفظانِ صحت کا انتظام نہ ہونے کے برابر ہے اور جوں جوں اسے زیادہ مریضوں سے سابقہ پڑا اور شہر میں گھومنے کا اتفاق ہوا اس کے خیال کی تصدیق ہوتی گئی۔ دق کی بیماری اس قدر عام تھی کہ کوئی اس کی طرف زیادہ توجہ ہی نہیں کرتا تھا، خصوصاً عورتوں میں۔ توجہ اس لئے نہیں کہ خاموش بیماریوں کے مقابلے میں ہلچل مچانے والی بیماریوں کی زیادہ آؤ بھگت ہوتی ہے مثلاً طاعون کی۔ عورتوں میں ہسٹیریا کی شکایت ایک مستقل وبا کی طرح پھیلی ہوئی تھی جو لوگ کسی خاص بیماری کا شکار نہ تھے وہ بھی سُست تھے، زرد رو، نہ آنکھوں میں رونق، نہ چہرے میں چمک، جیسے زندگی کی لہر ان کے جسم میں مقیّد ہو کر بالکل رُک گئی ہو۔ علی حسین کی تشخیص یہ تھی کہ لوگوں میں صالح خون پیدا نہیں ہوتا۔ جن کے پاس پیسہ ہے وہ ہاتھ پاؤں نہیں ہلاتے، کھلی ہوا اور ورزش سے محروم ہیں اور جو لوگ محنت مزدوری کرتے ہیں وہ زیادہ تر گندے اور تنگ و تاریک مکانوں میں رہتے ہیں۔ غلاظت تمام بیماریوں کی ماں ہے اور چونکہ امیر اور غریب سب بے حس بنے اسی غلاظت میں رہتے تھے اس لئے بیماریاں ان کے چاروں طرف منڈلاتی رہتی تھیں۔ جہاں موقع دیکھا چھاپہ مارا۔ اور چوں کہ مدافعت کی قوّت نہ تھی اس لئے دشمن کا مقابلہ کس بوتے پر کریں؟ گزشتہ بیس سال کے رجسٹروں میں سے اس نے شہر کی

صحت اور بیماریوں کے اعداد کا مطالعہ کیا اور اس سے اس کا شبہ اور مستحکم ہوگیا کہ کسی نے کبھی حفظانِ صحت کا معقول انتظام کرنے کی کوشش نہیں کی، بیماریوں کے روکنے کی تدبیریں نہیں سوچیں۔ بندروں کی طرح جب کبھی کوئی مصیبت سر پر آگئی۔ بھاگ دوڑ کرلی اور پھر ہاتھ پر ہاتھ رکھکر بیٹھ گئے، قسمت کا مقابلہ کون کرے؟ ایسا ہی ہوتا آیا ہے اور ایسا ہی ہوتا رہے گا! برخلاف اس کے علی حسین کو تمام شہر مجموعی طور پر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی جیتے جاگتے انسان کا جسم ہو جس کے تمام اعضا اور جوارح، تمام رگیں اور پٹھے ایک دوسرے سے منسلک اور وابستہ ہیں۔ اگر کہیں ایک جگہ بھی خراش آگئی تو سارا جسم بے چین ہو جاتا ہے۔

اور یہاں تو تمام جسم سراپا خراش، سراپا زخم بنا ہوا تھا۔ ہر غلاظت کا ڈھیر ایک ناسور تھا۔ ہر غلیظ کنواں ایک متعدی زخم۔ کہ جس نے اسے چھوا زہر سرایت کر جائے گا۔ بے شک لوگ پھر بھی زندہ رہ جاتے ہیں۔ یہ خدا کی قدرت ہے۔ لیکن ہم تو اپنی طرف سے خودکشی کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھتے! سڑکیں اس درجہ خراب تھیں کہ گرمی میں چھڑکاؤ سے محروم، وہ گرد اور غلاظت کے بگولے اٹھاتی تھیں جو شہر والوں کے پھیپھڑوں میں جا کر دم لیتے تھے اور برسات میں جا بجا پانی کے چھوٹے چھوٹے گڑھے بن جاتے تھے۔ جو مچھروں اور ملیریا کی آماج گاہ تھے۔ برسات کے پانی کے بہاؤ کا

کوئی انتظام نہ تھا۔ شہر کے ایک سرے پر ایک بہت بڑا تالاب بن گیا تھا
جس میں تمام پانی جمع ہوتا تھا وہ سال بھر وہاں کھڑا رہتا۔ جانوروں، آدمیوں
دونوں کے استعمال میں آتا۔ جانور پیتے، آدمی نہاتے۔ کپڑے دھوتے اور
کبھی ضرورت پڑتی تو پی لیتے۔ بیماری کو اس سے زیادہ پُر خلوص دعوت اور
کیا ہو سکتی ہے۔ چنانچہ رجسٹروں کے بے زبان اعداد و اندراجات نے علی حسین
کو بہت سے پُرانے عبرت ناک تماشے دکھائے۔ طاعون، ہیضہ، چیچک،
میعادی بخار۔ جب کبھی کوئی وبا آئی اس نے اپنی پوری بھینٹ لئے بغیر
کبھی دم نہیں لیا۔ جیسے کسی زمانے میں لوگ اپنے عزیزوں اور پیاروں
کو خونی دیوتاؤں کی بھینٹ چڑھاتے تھے اسی طرح یہ آنکھوں پھوٹے
مت مارے لوگ ایسی بیماریوں کا شکار ہوتے تھے۔ جن کا علاج سائنس
نے بالکل سہل اور یقینی کر دیا ہے یہ اسی جہالت کی ایک یادگار ہے کہ۔ اب
بھی بعض لوگ چیچک جیسی گھناؤنی بیماری کو ماتا کے نام سے پکارتے ہیں نا؟
علی حسین نے آنکھیں کھول کر یہ سب باتیں دیکھیں اور آنکھیں بند کر کے
اس مصیبت اور تباہی پر غور کیا۔ جس کی ذمہ وار مصلحتِ الٰہی نہیں بلکہ انسانوں
کی غفلت اور جہالت اور بے حسی ہے اور اس نے تہیّہ کر لیا کہ اس ہولناک
عفریت سے جنگ کریگا۔ تن تنہا جنگ کریگا۔ خواہ اس کا کچھ بھی انجام ہو۔
پہلے زمانے میں من چلے لوگ دیووں کی تلاش میں پھرا کرتے تھے کہ کہیں

رل جائیں تو بہادری کے جوہر دکھائیں۔ اب یہ دیو ہر کسی کے گھر میں گھسے آتے ہیں اور بربادی پھیلاتے ہیں لیکن کوئی ان سے جم کر لڑنے کو تیار نہیں ہوتا۔ موقع ملا تو ایک آدھ ہاتھ مار دیا، کبھی کارگر، اکثر اوچھا اور بس۔ اچھا ہیرے سور مار جاؤ۔ اس جہاد پر چڑھو مگر یاد رکھو کہ جہاد میں سربکف رہنا ضروری ہے اور وہی کچھ پاتا ہے جو سب کچھ کھونے کو تیار ہو۔

جنگ کا پہلا قدم یہ ہے کہ مخالفوں کی قوّت اور مرکزوں کا اندازہ کیا جائے۔ لہٰذا اس نے خاموشی کے ساتھ اپنے محلّے سے ابتدا کی اور اس میں جس قدر باتیں قابل غور اور قابل اصلاح تھیں انھیں ذہن نشین کرنا شروع کیا۔ سڑکوں اور کنوؤں کی صفائی، گڑھوں کا بھرنا، مکانوں کی مرمت، محلے والوں کے لئے تفریح اور کھلی ہوا کا انتظام، اشیائے خوردنی کی دیکھ بھال (آپ ناک بھوں کیوں چڑھاتے ہیں۔ انھیں چیزوں سے ڈاکٹر کا تعلق ہے اور انھیں پر آپ کی زندگی کا مدار) وہ شام کا وقت اسی تحقیق و تفتیش میں صرف کرتا تھا۔ اسی گشت کے دوران میں اس کی ملاقات اتفاقاً ایک نوجوان طالب علم سید محمدؐ سے ہو گئی جو علی گڑھ کالج میں پڑھتا تھا اور تعطیلات کے دوران میں آیا ہوا تھا، اس نے خفیف سے استہزا کے لہجے میں پوچھا۔ ”معاف کیجئے گا یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔“ ڈاکٹر نے لہجہ پہچان کر مصنوعی متانت سے جواب دیا ”میں کنوؤں اور گڑھوں کے

پانی کے نمونے جمع کر رہا ہوں۔" "جی ہاں یہ تو میں بھی دیکھ سکتا ہوں لیکن کیوں؟" (اسی لہجے میں) "اس لئے کہ یہ گندا اور غلیظ پانی ہے۔" "اور آپکو ایسے پانی کا شوق ہے؟" "ہاں۔ اس کے تجزیہ کا، تاکہ جراثیم کے پس تفتیش کر سکوں۔ بعض لوگوں کو اس کے پینے کا شوق ہوتا ہے۔" سید محمد ہنس پڑا۔ اسے اس سنجیدہ صورت ڈاکٹر کا طرز گفتگو پسند آیا اور دونوں میں ملاقات اور رفتہ رفتہ دوستی ہو گئی۔ سید محمد ایم اے میں ادب انگریزی کا طالب علم تھا اور دنیا کو انگریزی شعرا اور وہ بھی رومانی شعرا کی آنکھوں سے دیکھتا تھا۔ واقعات سے متنفر اور رضا و قدر کا قائل تھا۔ کالج کی تعلیم نے اس میں اور دنیائے آب و گل خصوصاً اس کے وطن کی کثیف دنیا میں بہت بڑا فصل پیدا کر دیا تھا۔ وہ تعطیل کے زمانے میں جتنے عرصے وطن میں رہتا گویا اپنی ناک پکڑے رکھتا تھا کہ وہاں کی کثافت اس پر اثر نہ کرے۔ لیکن یہ ایک جمالیاتی انداز تھا جس میں اتنی قوّت اور حرکت نہ تھی کہ اس کی قوّت عمل کو برانگیختہ کر سکے علاوہ اس کے وہ عمل کا زیادہ قائل بھی نہ تھا۔ جذبات کی دنیا اپنے قابو کی دنیا ہے، اس کو جس رنگ میں چاہے رنگ دیجئے۔ تخیّل نے پر پھڑپھڑائے اور کریم نگر کی کثیف ہوا پر سے منڈلاتا ہوا دور نکل گیا۔ دور جہاں حسن و عشق، شعراور جگنو، فطرت اور سادگی کا دور دورہ ہے، نہ محنت ہے نہ مشقّت، نہ کسان نہ مزدور، نہ امیر نہ غریب۔ اس کے تجربے میں دنیا کے بہت سے

مادّی اور عملی اور تکلیف دہ مسائل آئے ہی نہ تھے۔ یہ کیسے؟ یوں تو غربت اور جہالت اور کثافت اس کے چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی لیکن چوں کہ ان چیزوں نے کبھی اس کے احساس کو ٹھیس نہ لگائی تھی اس لئے وہ دراصل اس کے تجربے سے باہر تھیں۔ اس نے ان کو دیکھا تھا، ان کا مشاہدہ نہ کیا تھا۔ ڈاکٹر کی صحبت اور گفتگو نے اس کے سامنے گویا ایک نئی دنیا کا راستہ کھولدیا۔ ایسی دنیا جو سالہا سال سے اس کے روبرو پڑی ہوئی تھی لیکن اس نے کبھی اس طرف توجہ نہ کی تھی۔ اول اول تو وہ ڈاکٹر کی اس دنیا کا مذاق اڑاتا تھا۔ کہتا "آپ کو ان گندے کیڑے مکوڑوں سے ان بیماریوں کے جراثیم سے کیوں ایسی دلچسپی ہے۔ آپ کو ان سے گھن نہیں آتی؟" ڈاکٹر اپنے مخصوص انداز میں سنجیدگی اور ظرافت کے ملے ہوئے انداز میں، اس کے جمالیاتی اصولوں اور تعصبوں پر ہنستا اور اس کے خیالی مگر رنگین قلعوں کو اس طرح توڑ دیتا جس طرح کوئی پانی کے بلبلے کو سوئی سے چھیڑ دے۔ "ورڈز ورتھ کو تم بہت پسند کرتے ہو نا؟ سنا ہے اس نے پھولوں اور خوبصورت پودوں کی تعریف میں بڑی وجد آور نظمیں لکھی ہیں۔" سید محمد بیچارہ سادہ لوح آدمی سوال کا رُخ نہ پہچانتا۔ کہتا "ہاں لکھی ہیں۔ اس کی فطرت کی شاعری کا کیا کہنا۔ مگر میرے سوال سے اس کو کیا مطلب؟" "مجھیں معلوم ہے کہ اس ایک خوبصورت پھول میں بعض اوقات ایسے زہریلے کیڑے ہوتے ہیں کہ خدا کی پناہ۔ اور

پانی کے ایک ایک قطرے میں اتنے جراثیم ہوتے ہیں کہ اگر فطرت خود ہی ان سے بچاؤ کا انتظام نہ کرے تو انسان کی زندگی محال ہو جائے۔ شاعر کو آسمان اور سمندر کی بسیط وسعت میں خدا کی قدرت نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر کو غلیظ پانی کے ایک قطرے میں اسی قدرت کا کرشمہ دکھائی دیتا ہے (دفعتہً سنجیدگی سے) میرے عزیز دوست، انسان محض شہد اور شبنم پر زندگی بسر نہیں کر سکتا نہ شعر اور شاعری اور جمالیات اس کے لئے کافی ہیں۔ زندگی ایک کھیل ہے جو اسی دنیائے آب و گل کے سٹیج پر کھیلا جاتا ہے اور جب تک ہم اس اسٹیج کی خصوصیات اور مطالبات کو نہ سمجھیں اور ان کا لحاظ نہ رکھیں زندگی کا چرخہ چل ہی نہیں سکتا۔ ادب اور آرٹ، فرصت صحت اور دماغی سکون کے مشغلے ہیں۔ اگر انسان کو یہ چیزیں نصیب نہ ہوں اور وہ ہر وقت بیماری کے چکر میں پڑا رہے تو ان کی طرف توجہ ہی نہیں کر سکتا۔ مانا تم یا تمھاری طرح چند اور خوش نصیب لوگ ایسے ہیں جن کو بغیر محنت کے یہ چیزیں حاصل ہیں اور وہ اپنے نفاست پسند جذبات کی دنیا میں رہ کر اپنا دل بہلا سکتے ہیں۔ لیکن ننانوے فی صدی بلکہ اس سے بھی زیادہ لوگوں کے لئے زندگی کا یہ فلسفہ کیسے کام دیگا؟ اور پھر وہ خوش نصیبی بھی کس کام کی جس کے چاروں طرف افلاس اور غربت کے منظر ہوں جیسے کوئی شخص سمندر کے کنارے پر بیٹھکر محتاج اور بیکس ساتھیوں کو ڈوبتا دیکھے اور بانسری بجا کر اپنا دل خوش کرلے۔" ڈاکٹر عادتاً کم گو آدمی تھا اور

جذبات کی تشہیر نہ کرتا تھا۔ لیکن کبھی کبھی اپنے خاص دوستوں کے سامنے
جن میں اسے دلچسپی ہوتی تھی وہ ان بے چین خیالات کو بے نقاب
کر دیتا تھا جو اس کے دل میں طوفان بپا رکھتے تھے۔ اس کی صحبت میں سید محمد
کو پہلی مرتبہ اندازہ ہوا کہ دُنیا کی مصیبتوں اور خرابیوں کو آنکھیں کھول کر دیکھنا
اور ان کو رفع کرنے کی فکر کرنا بھی انسان کا فرض ہے۔ شاعرانہ نفس پرستی
کے بجائے اسے خدمت کے نصب العین کی جھلک دکھائی دی۔ اس نے کہا۔
" میں بھی تمھارے کام میں مدد کرونگا۔ تم بہت مصروف آدمی ہو۔ بغیر اپنے
کام کا حرج کئے تم سارے شہر کی چھان بین نہیں کرسکتے۔ اس میں سے کچھ
کام مجھے دے دو۔ تمھیں جو معلومات درکار ہیں میں انھیں مہیا کر کے
تمھارے سپرد کردونگا" اور اس نے نہ صرف خود ایسا کیا بلکہ مقامی مدرسوں
سے چند ایسے طالب علم اپنے ساتھ لئے جنھیں اس کام سے دلچسپی تھی
اور چند ہی روز میں تمام کام پورا کر کے اس کی رپورٹ ڈاکٹر کے سپرد کردی
اور اپنے ساتھیوں کو اس کے سامنے پیش کر کے کہا کہ جو کچھ کیا ہے ان لوگوں
نے کیا ہے۔ ڈاکٹر نے ان کی بہت ہمت بڑھائی اور ان سے کہا کہ " اپنے
وطن کی یہ ایک بڑی خدمت ہے کہ اسے رہنے کے قابل بنایا جائے۔
اگر تم لوگ میری مدد کروگے تو امید ہے کہ ہمیں بہت جلد کامیابی ہوگی "
چنانچہ ایک ہی مہینے میں اس نے قصبے کے متعلق ہر قسم کے ضروری اعداد و

شمار جمع کرلئے - جہاں جہاں بیماریوں کے مرکز تھے ان کا معائنہ کیا اور اپنی پُرجوش جماعت کی مدد سے قصبے کا ایک بڑا نقشہ تیار کیا جس میں نہ صرف یہ تمام مقامات دکھائے بلکہ یہ بھی ظاہر کیا کہ قصبے کی صحت کو درست کرنے کے لیے کیا تبدیلیاں ضروری ہیں -

(۵)

اب کیا رہا ہے اب تو میدان مار لیا - شہر کا بولتا ہوا نقشہ تیار ہو گیا ہے اور اگر کوئی عقل سے ایسا بے بہرہ ہو کہ اسے ایسی صاف چیز بھی سمجھ میں نہ آئے تو بیماریوں کے پُرانے اعداد و شمار موجود ہیں - ان اٹل دلیلوں کے سامنے کسی کی کیا چل سکتی ہے ؟ کمیٹی والوں کو اب ہاتھ پاؤں ہلانے پڑیں گے - اور کیوں نہ ہلائیں گے ؟ آخر وہ بھی تو انسان ہیں، ان میں بھی انسانی ہمدردی ہے اور خود ان کو اسی شہر میں رہنا ہے - ان لوگوں کو قائل کرنا کھلے دروازہ کا کھولنا ہے - ضرور کھل جائے گا - کیا امر مانع ہو سکتا ہے ؟ نوجوان، ناتجربہ کار ڈاکٹر کے ذہن میں اسی قسم کے خیالات گھوم رہے تھے - لیکن اس بنی بنائی اسکیم کو کس کے پاس لے جائے ؟ بہتر یہی ہو گا کہ شہر کے سرکاری ڈاکٹر لبشن چند کو اس کام میں شریک کیا جائے - ان کا لوگوں پر اثر ہے اور پھر در اصل یہ کام انھیں کا ہے میں تو گویا خواہ مخواہ دخل دے رہا ہوں - ہاں وہ مجھ سے اسپتال کے معاملہ میں ذرا ناراض ہو گئے تھے

اور بعد میں بھی ایک دو مرتبہ ملاقات ہوئی تو وہ کشیدہ اور ناخوش سے معلوم ہوتے تھے۔ مگر اتنے بڑے معاملے میں جہاں ہزاروں بندگانِ خدا کی صحت اور تندرستی کا معاملہ ہے میں اپنی ذرا سی ذاتی رنجش کو کیوں دخل دوں؟ غرور اور خود پسندی کو خیرباد کہکر کام کرنا چاہیئے ورنہ کام نہیں چلے گا۔ اور اصلی چیز تو کام ہے۔ انسان تو محض ایک وقتی آلہ کار ہے جو اس کو انجام دیتا ہے اور ختم ہو جاتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جب ڈاکٹر بشن چند معاملے کی سنجیدگی اور اہمیت کا اندازہ کریں گے تو وہ بھی ذرا سی پرخاش بھول جائیں گے (اچھا جاؤ ان سے ملو اگر مان جائیں اور مدد دینے پر راضی ہو جائیں تو چشم ما روشن دلِ ماشاد۔ ورنہ تمھاری عقل اور تجربے میں کچھ اضافہ ہی ہوگا!)

انھیں باتوں کو سوچتا ہوا وہ ایک روز اپنے ہم پیشہ ڈاکٹر کے یہاں پہنچا۔ شام کا وقت تھا وہ اپنے سرکاری مکان کے باہر بیٹھے ہوئے چند دوستوں سے بات چیت کر رہے تھے۔ خلاف توقع ان کو آتا دیکھ کر سب خاموش ہو گئے۔ اس طرح جیسے لوگ کسی ناگوار مداخلت کی وجہ سے ہو جاتے ہیں۔ وجہ یہ بھی کہ اتفاق سے اس وقت ڈاکٹر صاحب اپنے حواریوں کے ساتھ انھیں کے متعلق گفتگو کر رہے تھے۔ کچھ تو وہ ان کی ابتدائی حماقت اور ناسمجھی پر ناراض تھے اور کچھ گزشتہ چند ماہ میں لوگوں کے لگاتے بجھانے سے اور زیادہ ناراض ہو گئے تھے۔ ان کا عندیہ دیکھکر لوگ انھیں خوش کرنے کے

لئے ان کی بُرائیاں کیا کرتے تھے۔ "وہ ڈاکٹر تھوڑا ہی ہے وہ تو اناڑی بازی گر ہے معمولی معمولی بیماریوں کی دوائیں بھی نہیں آتیں۔ کسی کو کہدیا کہ ورزش کی ضرورت ہے، کسی کو تازہ ہوا پر ٹال دیا۔ جیسے کوئی محض ہوا کھانے سے اچھا ہو سکتا ہو! کسی کو کہدیا مکان صاف رکھو۔ بیماری جاتی رہے گی۔ بات کرنے کا سلیقہ نہیں۔ جاہلوں اور کمینوں میں رہکر سبھی سے اس طرح بات کرنے کی عادت ہو گئی ہے۔ جیسے اپنے سے کم درجے کے لوگوں سے بات کرتے ہیں۔ اگر کوئی اس کی بات نہ مانے تو اُسے ڈانٹ دیتا ہے اور ہر بات میں دخل دینے کا، پوچھ گچھ کرنے کا مرض ہے معلوم نہیں کس خاندان کا آدمی ہے۔ اسی طرح اکثر باتیں ہوا کرتیں۔ آج بھی یہی سلسلہ چلا ہوا تھا۔ ایک صاحب ایک نئی خبر لائے تھے کہ چند روز ہوئے میں نے مدرسے کے چند لڑکوں کو شہر میں بے کار گھومتے ہوئے دیکھا ان میں میرا لڑکا بھی تھا۔ جب میں نے اسے گھر پر ڈانٹا کہ تو کیوں خدائی خوار گدھے سوار پھر رہا ہے تو اس نے جواب دیا کہ ہم تو شہر کا نقشہ تیار کر رہے ہیں۔ میں نے پوچھا وہ کیا؟ کہنے لگا ہمارے ڈاکٹر نے ہمیں سمجھایا تھا کہ شہر کی حالت اچھی نہیں لوگوں کی صحت خراب ہوتی جاتی ہے اس کی روک تھام کرنی چاہیئے اور معلوم کرنا چاہیئے کہ کیوں ایسا ہے چنانچہ ہم نے ایک ٹولی بنائی ہے اور ہم ہر محلے کا معائنہ کرتے ہیں۔ اس کی رپورٹ لکھتے ہیں اور اسے ڈاکٹر

صاحب کے پاس لے جاتے ہیں۔ انھوں نے شہر کا ایک بہت بڑا نقشہ تیار کیا ہے۔ میں نے اس کی یہ باتیں سُن کر اس سے صاف صاف کہدیا کہ خبردار جو تو کبھی ان لڑکوں کے ساتھ گیا۔ ان کا اور اس ڈاکٹر کا دماغ خراب ہے۔ میں اپنے لڑکے کو صفائی کا داروغہ بنانا نہیں چاہتا۔ مگر وہ بڑبڑاتا ہوا باہر چلا گیا کہ اس میں کیا بُرائی ہے یہ تو اپنے قصبے کی خدمت ہے جو سب کو کرنی چاہیئے .... اس خوفناک خبر پر اُسے زنی ہو رہی تھی کہ اصلی مجرم خود ہی وہاں آ پہنچا اور اتفاق کی خوبی کہ ڈاکٹر بشن چند کو جن کی دبی ہوئی مخالفت اس ذکر سے مشتعل ہو گئی تھی مقابلے کے لیئے بالکل تیار پایا۔

علی حسین کو خوش اسلوبی کے ساتھ معاملہ پیش کرنا نہیں آتا تھا۔ چاہیئے تھا کہ پہلے اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے بشن چند کو ہموار کرتا۔ اور پورے دل سے پچھلی جھڑپ کی معافی مانگتا۔ ان کی قابلیت کی تعریف اور نیکنامی کا تذکرہ کرتا۔ مگر بجائے اس کے، (ڈاکٹر صاحب، مجھے آپ سے تخلیہ میں کچھ باتیں کرنی ہیں۔ اگر آپ کو چند منٹ کی فرصت ہو" (صاف گوئی کے معنے ہیں کہ ہتھوڑے کی چوٹ ماری جائے!) انکار تو کیسے کرتے ایک ڈاکٹر کی درخواست تھی اگرچہ ڈاکٹر تیلیوں والا تھا۔ اُٹھکر اندر کمرے میں جا بیٹھے۔ "فرمایئے!" "میں اس وقت ایک خاص غرض سے آیا ہوں اور مجھے امید ہے کہ آپ اس میں میری مدد کرینگے۔ کیونکہ یہ سارے شہر کے فائدے کا کام

ہے اور ہم سب کا فرض ہے کہ اس میں ہاتھ بٹائیں"۔ (نہایت سرد مہری سے)
"سنائیے تو کیا کام ہے"۔ علی حسین نے اپنے بیگ سے کچھ کاغذات اور ایک
نقشہ نکالا "ان پر ذرا نظر ڈال لیجئے۔ میں اس قصبے کی صحت اور بیماری
اور لوگوں کی بود و باش اور محلوں کی صفائی کے متعلق چند ہفتے سے تحقیقات
کر رہا ہوں اور اس کے نتائج ان کاغذات پر درج ہیں اور اس نقشے
کی شکل میں بھی موجود ہیں۔ ان کو دیکھکر آپ کو اندازہ ہو جائیگا کہ قصبے
کی حالت کیا ہے اور اگر بہت جلد تدارک نہ کیا گیا تو حالت بد سے بدتر
ہو جائے گی"۔ سلگتی ہوی آگ پر مٹی کے تیل چھڑکنے کا نتیجہ دیکھا ہے؟
وہی ہوا۔ (غصے میں چیخ کر) میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کو شہر کی حالت سے
کیا مطلب۔ آپ شہر کے اندیشے سے کیوں دُبلے۔ آپ ان معاملات
میں دخل و معقولات کرنے والے کون ہوتے ہیں۔ شہر کی جو کچھ حالت ہے
مجھے معلوم ہے میں آپ کی امداد کا محتاج نہیں ہوں۔ چار دن آپکو آئے
ہوئے اور آپ نے سب تحقیقات کر ڈالی! سُن لیجئے کہ اس شہر کی
صحت کا ذمہ دار میں ہوں اور میں اس بات کا روادار نہیں کہ دوسرا
شخص اس میں اپنی ٹانگ اڑائے"۔ علی حسین میں تجربہ اور رنہاؤ کا سلیقہ
ضرور کم تھا۔ لیکن اس کا دل بہت بڑا تھا۔ اس میں تنگی اور خود غرضی کا گزر
نہ تھا۔ وہ کام میں دلچسپی رکھتا تھا، اپنی ذاتی شان کی طرف سے

بے پروا تھا۔ بہت دھیمے اور سنجیدہ لہجے میں اس نے جواب دیا:۔

"ڈاکٹر صاحب، آپ بے شک مجھ سے زیادہ واقف اور تجربہ کار ہیں اس لیئے میں ان تمام چیزوں کو آپ کے پاس لایا ہوں کہ آپ کو اپنے کام میں ان سے مدد ملے۔ ممکن ہے آپ مجھ سے ذاتی طور پر کسی وجہ سے ناراض ہوں لیکن یہ صحت عامہ کا معاملہ ہے۔ اس میں ذاتی رنجش کو دخل نہ دیجئے۔ میں اس کام کے سلسلے میں کوئی ذاتی شہرت یا اعتراف نہیں چاہتا۔ اصل مقصد یہ ہے کہ کام ہو جائے خواہ اسے ایک آدمی کرے یا دوسرا۔ آپ کو ایسے اختیارات اور سہولتیں حاصل ہیں کہ آپ اسے آسانی سے کر سکتے ہیں۔ میں نہیں کر سکتا۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ مجھ سے وعدہ کر لیں کہ ان کاغذات کا غور سے مطالعہ کر کے مناسب کارروائی کریں گے۔ اس کے سوا میری کوئی خواہش نہیں (مسکرا کر) میں آپ کے اختیارات اور فرائض میں دخل درمعقولات کرنا نہیں چاہتا۔"

بحث میں ہارنا ہمیشہ غصّہ کو تیز کر دیتا ہے۔ خصوصاً ایسی حالت میں کہ مخالف متانت اور صلح جوئی کی باتیں کر رہا ہو اور خود کوئی دنداں شکن دلیل یا جواب نہ سوجھے۔ چنانچہ بیچارے بشن چند نے یہی طریقہ اختیار کیا۔

"آپ میرا وقت ضائع نہ کیجئے۔ میں کوئی وعدہ کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ مجھے آپ کے سب حالات اچھی طرح معلوم ہیں۔ آپ میری بیخ کنی کی فکر

میں ہیں۔ اسی وجہ سے آپ نے خفیہ خفیہ بغیر میری اجازت کے یہ جھوٹ سچ اعداد و شمار جمع کئے ہیں۔ اسی وجہ سے آپ نے آتے ہی میرے انتظام میں نقص نکالنا شروع کیا تھا۔ احسان ماننا اسی کو کہتے ہیں کہ میں نے آپ کو اسپتال میں کام کرنے کا موقع دیا اور آپ نے فوراً میری مخالفت شروع کر دی۔ آپ مجھے دھوکہ نہیں دے سکتے۔ لے جائیے اپنے کاغذات اور جو نام دت تجئے انھیں آگ میں۔ میں آپ کو شہر کے معاملات میں دخل نہ دینے دونگا۔"

علی حسین یہ گفتگو سن کر چکر میں آ گیا۔ اس کو یقین نہیں آتا تھا کہ کوئی شخص اس طرح اپنی آنکھیں بند کر کے انصاف کا خون کر سکتا ہے۔ اس نے کبھی جان بوجھ کے ان کے ساتھ بُرائی نہیں کی تھی لیکن وہ اس کی مخالفت میں اس سے بات بھی کرنے کے روادار نہیں۔ اس نے پھر ایک مرتبہ اُسی دھیمے لہجے میں پوچھا اور اس کی آنکھیں ان کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں گویا دل کی اصلی بات کھود کر باہر نکال لیں گی: "آپ ان کاغذات کے دیکھنے کے لیئے بھی تیار نہیں؟" بشن چند کا چہرہ متغیر تھا اور دل شکست کے احساس سے ڈانواں ڈول۔ لیکن انسان قدرتاً ہار ماننے سے کتراتا اور جھوٹی کامیابی کو صداقت پر ترجیح دیتا ہے۔ اپنے اندرونی احساس شکست کو دبانے کے لیئے انھوں نے بہت بلند آواز سے جواب دیا۔

"نہیں، ہرگز نہیں" "نہیں؟ تو اب جو کچھ ہو اس کا خمیازہ آپ کے سر ہیں نے اپنی طرف سے حجت پوری کر لی۔ مگر آپ کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی ہے۔ آپکو کچھ دکھائی نہیں دیتا اور جو شخص اپنا فرض پورا نہ کرے اور دوسرے کے یاد دلانے پر برافروختہ ہو مجھے اس کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں۔ سن لیجئے آج سے میری اور آپ کی لڑائی ہے۔ اس قصبے کی درستی تو ہو کر رہے گی۔ آپ جو کچھ کر سکیں کر لیجئے اور مجھ سے بھی جو کچھ ہو گا میں کروں گا۔ مجھے فطرتاً لڑنے کا شوق نہیں۔ لیکن آپ نے میرے اندر کسی سوتے ہوئے بھوت کو جگا دیا ہے۔ آپ اس سے خبردار رہیں" یہ کہکر بغیر جواب کا انتظار کئے اس نے اپنا بیگ اٹھایا اور کمرے سے نکل کر بشن چند کے دوستوں کے بیچ میں سے ہوتا ہوا ان کے گھور کا جواب کڑی نگاہوں سے دیتا چلا گیا۔ اور جو سخت سست باتیں ڈاکٹر صاحب کی زبان پر آنکے لئے پیچ و تاب کھا رہی تھیں وہ انھوں نے باہر آ کر اپنے دوستوں کو سنا ئیں کہ میں نے اسے یوں ڈانٹا اور یوں قائل کیا۔ مشتے کہ بعد از جنگ یاد آید بر کلہ خود باید زد!

اکثر لوگ شکست کھا کر ہمت ہار بیٹھتے ہیں۔ لیکن بعض ایسے منچلے بھی ہوتے ہیں جن کا ذوقِ گناہ سزا کے ساتھ بڑھتا ہے۔ یہ ڈاکٹر بھی انھیں لوگوں میں سے تھا۔ چوٹ کھا کر رونا اور ہار کر بھاگنا اس نے سیکھا ہی نہ تھا۔ یہاں سے "فارغ" ہو کر اس نے تحصیلدار صاحب کی طرف رخ کیا۔ اسے

پہلی ملاقات یاد تھی لیکن اس نے سوچا کہ ایمانداری کا تقاضا یہ ہے کہ ایک دفعہ اور انھیں فرض کی طرف توجہ دلائے۔ لیکن تحصیلدار صاحب نے اسے جمنے ہی نہیں دیا۔ وہ معاملے کی سُن گُن پا چکے تھے۔ جیسے ہی اس نے یہ ذکر اُٹھایا اُنھوں نے صاف کہدیا: "معاف کیجیے مجھے ان جھگڑوں کے سُننے کی فرصت نہیں۔ میرا کام شہر میں امن و امان قائم رکھنا اور سرکاری احکام کی تعمیل کرنا ہے۔ غلاظت کے ٹوکرے ڈھونا نہیں اور میں تو آپ کو بھی یہی مشورہ دونگا کہ اپنے کام سے کام رکھئے اور خواہ مخواہ کے جھگڑوں میں نہ پڑیئے،، اور قبل اس کے کہ وہ کوئی جواب دے سکے اُنھوں نے فرار میں مصلحت سمجھی اور خود ہی اُٹھکر باہر چلے گئے! واقعاً صاف گو اور اکھڑ آدمی سے پرہیز کرنا چاہیئے نہ معلوم کیا کہہ بیٹھے کیا کر بیٹھے اور ہماری عافیت میں خلل ڈالدے...... ان تلخ تجربوں نے اس کی آنکھیں کسی قدر کھولدی تھیں۔ مگر اتمام حجت کے لئے اس نے شہر کے کئی اور سربرآوردہ لوگوں سے ملاقات کی۔ ان کے جواب کا انداز مختلف تھا لیکن نتیجہ ایک ہی۔ ان میں سے کوئی شخص شہر کی بہبودی کے لئے ذراسی زحمت اُٹھانے کو بھی آمادہ نہ ہوا۔ اصلاح اور صفائی اور حفظانِ صحت بہت اچھی چیزیں ہیں لیکن دریا میں رہکر مگر مچھ سے بیر رکھنا کون سی دانائی ہے اور یہ خبر چند ہی روز میں عام ہوگئی تھی کہ ڈاکٹر علی حسین نے شہر کے مگر مچھوں کو اپنا مخالف بنالیا ہے۔ کسی نے

کہا بغیر حکام شہر کی مدد کے یہ کام ناممکن ہے آپ اس پر اپنا وقت اور توجہ کیوں ضائع کرتے ہیں۔ کسی نے کہا کہ جو بات ہمیشہ سے ہوتی آئی ہے اس کو بدلنے کی کوشش کرنا قدرت کے خلاف جنگ کرنا ہے۔ اگر مصلحت الٰہی یہ ہوتی کہ کریم نگر میں بیماریاں اور وبائیں نہ آنے پائیں تو خدا بغیر آپکی مدد کے بھی یہ کام کرسکتا ہے۔ ایسے لوگوں کو یہ کون کہے کہ خدا کی عادت نہیں کہ ہاتھ پاؤں والے اپاہجوں کی خدمت گزاری کرے اور یہ کون بتلائے کہ یورپ اور امریکہ کے اکثر ملکوں میں بہت سی بیماریوں اور وباؤں کو انسان نے اپنی کوشش سے زیر کرلیا ہے؟ (اور بتائے بھی تو کیا فائدہ؟) ایک صوفی منش صاحب نے جو عقل کی انتہائی پختگی کو پہنچ چکے تھے اور دنیا کی حقیقت کو پہچانتے اور اسے مایا کا جال جانتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کو یہ سمجھا کر تسلّی دی: "سنئے اول تو انسان کے لئے ہاتھ پاؤں ہلانا ہی ایک فعل عبث ہے۔ انسان کی تمام کوشش ایسی ہے جیسے کوئی مکھی شہد میں گر کر ہاتھ پاؤں مارے۔ وہ جس قدر زیادہ اضطراب اور تیزی کے ساتھ چکّر کھائے گی اسی قدر زیادہ گرفتار ہوتی جائے گی اور بہت جلد اس کی حرکات ہمیشہ کے لئے بند ہوجائیں گی۔ اصل عقل مندی یہی ہے کہ آدمی پانی کی دھار کے ساتھ جہاں تک ممکن ہو، خاموش، بے حس و حرکت بہتا چلا جائے اور پھر اس قصبے کے لوگ تو اس قابل ہی نہیں کہ کوئی ان کے لئے دردسر اور دنیا بھر

کی مخالفت مول لے۔ یقین جانیئے اگر آپ ان کے لئے جنت کے محل لاکر
کھڑے کر دیں تب بھی یہ آپکا احسان نہ مانیں گے اور پانچ دس برس کے اندر
ان محلوں کو بھی ایسا ہی غلاظت کا گھر بنا دیں گے۔" ڈاکٹر نے یہ فلسفۂ زندگی
پہلے نہ سُنا تھا کیونکہ یوں تو یہ بہت سے لوگوں کے دل و دماغ پر مسلّط
ہوتا ہے لیکن زبان پر کم آتا ہے۔ کیونکہ زبان کا سب سے بڑا کام یہی ہے کہ
جہاں تک ہو سکے نہ صرف دوسروں کو بلکہ خود کو بھی دھوکہ دیتی رہے۔
جب اُنھوں نے کسی قدر بھوچکا ہو کر پوچھا کہ اگر کسی کی فطرت ہی کا یہ تقاضا
ہو کہ وہ محنت اور جد و جہد کرے اور نہ صرف اپنے بلکہ دوسروں کے لئے بھی
اپنی جان کھپائے تو انھوں نے اس کا یہ خوبصورت جواب دیا کہ اگر کسی کی
فطرت کا یہ تقاضا ہو کہ وہ خود کشی کرے یا قتل کرے تو؟ یہ جواب اس قدر
دنداں شکن تھا کہ بے چارے ڈاکٹر کو اس کا کچھ جواب نہ سوجھا اور وہ لوگوں
کی ذہنیت پر افسردگی کے ساتھ غور کرتا لوٹ آیا۔
اب بھی اگر ڈاکٹر میں سمجھداری اور مصلحت اندیشی آگئی ہوتی تو وہ
اس منصوبے سے باز آجاتا اور یہ سمجھ لیتا کہ چھلاووں کے پیچھے بھاگنے سے
کیا فائدہ؟ لیکن اس کی طبیعت میں فولاد کا عنصر زیادہ تھا اور اس کو اس کے
ارادے سے ہٹانا محال۔ اس نے ابکی مرتبہ یہ کوشش کی کہ کسی طرح
یہ سوال کمیٹی کے سامنے پیش ہو تاکہ کم از کم لوگوں کو حقیقت حال معلوم

ہو جائے۔ شاید کچھ خدا کے بندے ایسے نکل آئیں جو جان بوجھ کر زہر کھانا پسند نہ کریں۔ اس کے دوست سیٹھ صاحب جو کمیٹی کے ممبر بھی تھے اس معاملہ کو پیش کرنے کے لئے راضی ہو گئے۔ ان کے دل میں یہ کھٹکا ضرور تھا کہ یہ بیل منڈھے نہیں چڑھے گی۔ لیکن انھیں ڈاکٹر کی خاطر بہت عزیز تھی۔ ایک جلسے میں انھوں نے شہر کی خراب حالت کی طرف توجہ دلائی اور جس طرح ڈاکٹر نے ان کو سمجھا دیا تھا اس کے خطرات سے ممبروں کو آگاہ کیا۔ لیکن کمیٹی کے مقتدر اراکین نے ان کی مدلّل تقریر کو ہنسی میں اڑا دیا اور کہا کہ۔ آپ نے کوئی ہول ناک خواب دیکھا ہوگا۔ ڈاکٹر بشن چند جو شہر کے محافظ ہیں بالکل مطمئن ہیں۔ ہم سب لوگ یہیں رہتے ہیں۔ ہمیں کبھی یہ خوف ناک جن اور بھوت نظر نہیں پڑے۔ جن سے آپ ہمیں ڈراتے ہیں۔ تحصیلدار صاحب نے مسکرا کر صاف صاف کہہ دیا کہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو اس نئے خبطی ڈاکٹر نے پٹی پڑھا دی ہے۔ اس پر سیٹھ صاحب جو ذرا آزاد طبیعت آدمی تھے کسی قدر گرم ہوئے اور انھوں نے ڈاکٹر کی قابلیت اور خلوص کی تعریف کی۔ لیکن اکیلا چنا بھاڑ کیا پھوڑ سکے گا۔ انھیں یہ محسوس ہوا کہ بعض خاموش ممبران کے ہم خیال ہیں لیکن انھیں یہ ہمت نہ ہوئی کہ ان بڑے دہانوں کی توپوں کے سامنے اپنا منہ کھولتے۔ جلسہ "بخیر و خوبی" تمام ہوا۔ اور کمیٹی کا روپیہ مجنونانہ تجاویز کی نذر ہونے سے بچ گیا۔

(۶)

ڈاکٹر کی چھوٹی سی جماعت جس میں علاوہ سید محمدؐ سیٹھ صاحب اور اسکول کے طلبہ کے شہر کے چند اور لوگ بھی شامل ہو گئے تھے - ان تمام حالات سے باخبر تھی - ان پر ڈاکٹر کے خیالات کا اس قدر گہرا اثر پڑا تھا کہ انھیں یہ ساری اندھی مخالفت اور رخنہ اندازی بہت گراں گزری اور یہ فکر لاحق ہوئی کہ کسی طرح اس کام کو شروع کیا جائے - چنانچہ ایک روز سید محمد اور چند جوشیلے طلبہ نے آپس میں مشورہ کیا اور ڈاکٹر کے سامنے اپنی یہ تجویز پیش کی کہ صفائی اور حفظان صحت کا کام چھوٹے پیمانے پر کسی ایک محلے میں شروع کر دیا جائے اور ساتھ ہی یہ کہا کہ اس کے لئے سب سے زیادہ موزوں جگہ تیلیوں کا محلہ ہے جہاں آپ کا بہت اثر ہے اور کام کرنے کی کافی گنجائش ہے - اندھے کو کیا چاہیے ؟ دو آنکھیں - ڈاکٹر نے ان کی اس تجویز کو منظور کیا - اسے بہت خوشی ہوئی کہ اس کے خیالات کا بیج ایسی زرخیز زمین میں پڑا - اس کے نوجوان ساتھی یوں خوش تھے کہ انھیں ایک دلچسپ اور مفید مشغلہ ہاتھ آیا - اس نے اس کام کو ہمیشہ ان کے سامنے اسی صورت سے پیش کیا تھا - گویا وہ ایک اسکاؤٹنگ کا کھیل ہے مگر اس کے معمولی کھیلوں سے بہت زیادہ مفید اور جرأت آزما کھیل - اب سوال یہ درپیش ہوا کہ اس کام کے لئے روپیہ کہاں سے آئے - دماغ اور انتظام

کی صلاحیت ڈاکٹر میں کم نہ تھی۔ ہمت، جوش اور ہاتھ پاؤں اس کے ساتھیوں کے پاس موجود تھے۔ لیکن روپیہ اس کے پاس تو تھا ہی نہیں اور ان کے پاس بہت کم تھا اس موقع پر پھر سیٹھ صاحب کام آئے جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ اس قسم کی تجویز ہو رہی ہے تو انھوں نے خود ڈاکٹر کے پاس جا کر ایک ہزار کے نوٹ اس کے سپرد کر دیئے اور کہا کہ تم نے مجھ پر اس قدر بڑا احسان کیا ہے کہ یہ رقم اس کا سال بھر کا سود بھی نہیں۔ اگر تمھیں اور ضرورت ہو تو بغیر تکلف اور مغائرت کے مجھ سے لے لینا۔ اس چندے سے ان لوگوں کی ہمتیں بہت بڑھ گئیں۔ کچھ رقم انھوں نے خاموشی سے خود اپنے اپنے حلقے سے جمع کی اور روپیے کی طرف سے مطمئن ہو کر کام کی طرف متوجہ ہوئے۔

ڈاکٹر کا اثر محلے والوں پر بہت کافی تھا۔ شاید ہی کوئی گھر ایسا ہو جہاں اس نے کسی کا علاج نہ کیا ہو اور اکثر بغیر فیس کے۔ خلوص کا اثر جاڑے کی دھوپ کی طرح لوگوں کے دل میں سرایت کر جاتا ہے۔ اس نے محلے کے تین چار بڑے بڑے بڈھوں کو بلا کر ساری تجویز انھیں سمجھائی اور کہا کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ تمھارے محلے کو شہر بھر میں سب سے زیادہ صاف اور ہوادار اور صحت بخش محلہ بنا دیں۔ وہ لوگوں سے ہمیشہ اس طرح باتیں کرتا تھا جیسے کوئی شخص اپنے برابر والے سے باتیں کرے۔ بڑے آدمیوں کے ساتھ وہ جھوٹی خوشامد اور خاکساری نہ برتتا تھا اور غریبوں پر رعب نہ جماتا تھا۔ اس کی گفتگو میں

نہ تصنع تھا، نہ اپنی بڑائی کا اظہار، نہ یہ جیسے کوئی شخص بچوں اور بے وقوفوں
کو کوئی بات سمجھانے کے لئے اپنی اصلی سطح سے اُتر کر باتیں کرتا ہو۔ سننے والے
کو محض یہ خیال ہوتا تھا کہ یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس کے متعلق یہ شخص زیادہ
جانتا ہے اور مجھے اپنا نقطۂ نظر سمجھا رہا ہے۔ اگر کسی اور معاملے کے متعلق مجھے
زیادہ واقفیت ہو اور میں اسے کچھ سمجھاؤں تو یہ میری بات کو توجہ سے
سُنے گا۔ اس لئے وہ اس کی باتیں غور سے سنتے تھے اور اس کے خلوص اور
کھرے پن کی وجہ سے انھیں منظور کر لیتے تھے۔ اور اب تو ان میں سے تقریباً
ہر ایک کی گردن اس کے احسان کے بوجھ سے دبی ہوئی تھی۔ انھوں نے
جلد ہی اپنی پنچایت کا جلسہ کیا اور وہاں یہ بات طے پا گئی کہ ہر طرح سے ڈاکٹر
کی مدد کی جائے اور اس کے حکم پر عمل کیا جائے۔ بلکہ انھوں نے یہ تجویز بھی
پاس کر دی کہ ہر گھر پر ایک روپیہ مہینے کا ٹیکس لگا دیا جائے تاکہ اس سے
خرچ پورا ہو سکے۔ چنانچہ کام بہت زور شور سے شروع ہوا۔ ڈاکٹر اور مدرسہ
کے طلبہ اپنی فرصت کے وقت میں اور محلے والے باری باری اور مزدور
روزمرّہ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق کام کرتے۔ کنوؤں کی صفائی کی گئی۔
پانی کا بہاؤ درست کیا گیا۔ نالیاں بنائی گئیں۔ گڑھے بھرے گئے۔ محلے کے
ایک سرے پر کچھ کھلی جگہ پڑی تھی جہاں برسات کے پانی کی ایک تلیّا تھی
اس کو پُر کر کے میدان کو ہموار کیا گیا تاکہ محلے کے بچّے وہاں تازہ ہوا میں کھیل

کو دیکھیں اور شام کو مرد اور عورتیں بھی فرصت کے وقت وہاں آجایا کریں۔
اس کے ساتھ ہی ساتھ ڈاکٹر نے یہ کوشش کی کہ کھانے پینے کی چیزوں کی نگہداشت کا کچھ انتظام ہو تاکہ گلی سڑی اور خراب چیزیں بکنے نہ پائیں اور ہر چیز مکھی وغیرہ کی غلاظت اور متعدی اثرات سے محفوظ رہے۔ اس کوشش میں اسے بہت دقت اُٹھانی پڑی۔ سڑکوں کا صاف کر دینا آسان ہے مگر دلوں کا صاف کرنا مشکل ہے، ذ ماغوں کے جالے لینا مشکل ہے، عمر بھر کی عادتیں دور کرنا مشکل ہے۔ پھر یہ کہ لوگ ہر کام کو مشین کی طرح انجام نہیں دے سکتے۔ ان کو باتیں بتانے اور سمجھانے کی ضرورت ہے چنانچہ اس نے اس صورت حال کی اصلاح کے لیئے اپنے ساتھیوں کی مدد سے ایک چھوٹا سا نائٹ اسکول جاری کیا جہاں وہ لوگوں کو نوشت وخواند نہیں سکھاتا تھا۔ بلکہ حفظانِ صحت کے اصول اور طریقے بتاتا تھا۔ تصویروں، شکلوں اور تختوں کے ذریعے انھیں دکھاتا تھا کہ کس طرح گندگی اور مختلف قسم کے جراثیم اور کیڑے مکوڑوں کی بدولت بیماری پیدا ہوتی ہے اور پھیلتی ہے اور لوگ کس طرح بہت خرچ اُٹھائے بغیر اپنے اپنے گھروں اور گلیوں کو پاک صاف رکھ سکتے ہیں، اپنے جسم کو تندرست اور طاقتور بنا سکتے ہیں۔ اپنی روزمرّہ کی غذا سے پورا فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ وہ ہر رات کو انھیں یہ باتیں بتاتا اور اس کے پرجوش شاگرد تیسرے پہر اور شام کے وقت ان غریب تیلیوں

اور مزدوروں کے گھروں پر جاتے اور ان سے ان امور کے متعلق بات چیت کرتے۔ جہاں کہیں گھروں میں یا گلیوں میں کوئی خرابی دیکھتے خود اس کی درستی کے لئے کام کرنے کو تیار ہو جاتے۔ ان کی دیکھا دیکھی وہ لوگ بھی زیادہ محتاط ہو گئے اور اس تمام اہتمام کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی مہینے کے اندر ان کی پنچایت نے کئی نئے قاعدے پاس کر دیئے۔ مثلاً یہ کہ جو شخص اپنے مکان کا کوڑا یا غلاظت گلیوں میں ڈالے اس پر جرمانہ ہوگا۔ محلے میں جتنی کھانے پینے کی دکانیں تھیں ان کے لئے لازم کر دیا گیا کہ وہ چھتوں اور جالی کی الماریوں کے ذریعے مکھیوں وغیرہ سے چیزوں کی حفاظت کریں ورنہ دوکانداروں کا حقہ پانی بند۔ جو خوانچے والے باہر سے آئیں ان پر بھی یہی شرائط عائد کی گئیں ورنہ ان کا محلے میں گھسنا ممنوع! پنچایت کی طرف سے ایک کمیٹی بنائی گئی۔ جس کا کام یہ تھا کہ ہر ہفتے محلّے کا دورہ کر کے دیکھے کہ ان تمام چیزوں کی پابندی ہوتی ہے یا نہیں۔ معلوم ہوتا تھا تمام لوگوں میں ایک نئی روح سرایت کر گئی ہے، ایک بڑے اور مشترک مقصد نے انھیں اپنی چھوٹی چھوٹی خود غرضیوں اور تنگدلی کی سطح سے اٹھا کر بلند کر دیا ہے۔ یہ نہیں کہ ان کام کرنے والوں کو ہمیشہ مطلع صاف ہی ملتا تھا۔ اکثر مشکلات پیش آتی تھیں (جب لوگوں کی زندگی کسی اعلیٰ نصب العین سے نا آشنا ہوتی ہے اور وہ اول اول اس کے ساتھ وابستگی پیدا کرتے ہیں تو ہر وقت کی احتیاط اور نفس کشی سے

طبیعت میں اُلجھن ہوتی ہے۔ پُرانی عادتیں عود کر آتی ہیں) لیکن ڈاکٹر کی اثر آفریں شخصیت اور لوگوں کے جوش کا یہ اثر تھا کہ وہ ان پابندیوں اور مجبوریوں کا بُرا نہ مانتے تھے۔ جب انھیں کسی بات پر ٹوکا جاتا تو یہ چراغ پا نہ ہوتے بلکہ آیندہ کو زیادہ احتیاط برتتے۔ (جب کسی پابندی کو اپنی طبیعت کا جز بنا لیا جائے تو رفتہ رفتہ نفس کشی میں اظہار خودی کا لطف آنے لگتا ہے اور انھیں پابندیوں کے اندر ایک نئی آزادی کا احساس پیدا ہوتا ہے جس کی چاشنی سے وہ پہلے نا آشنا تھے۔

ابھی اس جہاد کا آغاز ہی تھا اور ڈاکٹر کو اس کے انتظامات میں اس درجہ انہماک کہ سر کھجانے تک کی فرصت نہ تھی جو اس ایک خارجی مخالفت سے دوچار ہونا پڑا۔ ایک روز صبح کو اس کے یہاں نہ مہتر آیا نہ سقّہ۔ خیر کچھ انتظام ہو گیا۔ دوسرے دن اس لئے دریافت کرایا تو دونوں نے انکار کر دیا کہ صاحب ہم آپ کے یہاں کام نہیں کر سکتے۔ اسے بڑا تعجب کہ میرا سلوک ان لوگوں سے ہمیشہ اچھا رہا۔ پھر یہ کیا حرکت؟ لیکن مصروفیت اس قدر کہ زیادہ پوچھ گچھ نہیں کر سکا۔ اپنے نوکر سے کہا کہ دوسرے مہتر اور سقّے کا انتظام کر لو لیکن اس کو ہر طرف سے جواب ملا۔ اس نے پریشان ہو کر اپنے آقا سے رپورٹ کی۔ معلوم کیا تو پتا چلا کہ اسپتال اور کمیٹی کے بعض ذی اثر صاحبان کی عنایت ہے۔ ڈاکٹر بشن چندر کے کسی حواری نے بغیر ان کی اطلاع اور اشارے کے

سقوں اور مہتروں کو بلا کر فہمائش کر دی تھی کہ خبر دار جو علی حسین کے یہاں کام کیا اور چوں کہ وہ سب بے چارے سرکاری ڈاکٹر کے ماتحت ہوتے ہیں اور ان کا خیال تھا کہ انھیں کے ایما سے کہا گیا ہے اس لئے وہ مجبور ہو گئے۔ ڈاکٹر نے اس بات کا کسی سے ذکر نہیں کیا۔ خود اپنے نوکر کی مدد سے گھر کی صفائی اور پانی بھرنے کا کام شروع کر دیا اور ایک چٹھی کمیٹی کے پریزیڈنٹ کے نام لکھی کہ سقوں اور مہتروں نے میرے یہاں کام کرنے سے انکار کر دیا ہے چونکہ شہر کے تمام انتظامات کا تعلق آپ سے ہے اس لئے آپ اس کا تدارک کیجئے چار دن کے بعد ان کا جواب آیا کہ یہ آزادی کا زمانہ ہے کمیٹی کسی کو نوکری کرنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔ ڈاکٹر کے ہاتھ میں اس وقت ایک اتنا بڑا کام تھا کہ وہ اپنے ذاتی آرام اور آسائش کی خاطر ایک اور لڑائی مول لینے کے لئے تیار نہ تھا۔ چنانچہ اس وار پر بھی وہ چپ رہا۔ لیکن چند ہی روز میں ان کے ساتھیوں کو معلوم ہو گیا کہ یہ صورت ہے۔ ایک روز تیسرے پہر کو کچھ دوست ملنے آئے تو دیکھا کہ وہ خود مکان میں جھاڑو دے رہے ہیں۔ "ایں یہ کیا؟" "نوکر باہر کام کو گیا ہوا ہے میں نے کہا میں خود ہی کر لوں۔" "مگر مہتر کیوں نہیں آیا؟" "ہڑتال کر دی ہے۔ اسے اور اس کے ہم پیشہ لوگوں کو میری صورت پسند نہیں اس لئے گزشتہ دس روز سے کوئی میرے یہاں نہیں آتا" ان لوگوں کو یہ سن کر بہت غصہ آیا۔ محلے کے دو تین آدمیوں نے جو کبھی سرپھرے

کے لالچ سے دوسرے کے یہاں صفائی کرکے اپنی ذات میں بٹہ نہ لگاتے
نہایت اصرار کے ساتھ یہ خدمت اپنے ذمے لے لی۔ "وہ ڈاکٹر صاحب
تھیں اور بہت سا کام کرنا ہے جو ہمارے لئے زیادہ ضروری ہے" اور
سید محمدؐ نے جاکر ڈاکٹر بشن چندر سے شکایت کی اور انھیں خوب ڈانٹا۔ وہ
بنے لے چارہ اس معاملے میں واقعاً بے قصور تھا اور اس نے فوراً اس شکایت
کو دور کردیا۔ رفتہ رفتہ محلے کی حالت میں بہت بڑا انقلاب ہوگیا اور دوسرے
لوگوں کو بھی اس تعلیب ماہیت میں دلچسپی ہوئی۔ وہ آتے اور ان نئے
انتظامات کو غور سے دیکھتے اور دل میں سوچتے کہ کاش ان کے یہاں بھی
ایسا ہی ہوتا۔ لیکن چونکہ ان میں کوئی حرکت پیدا کرنے والا شخص موجود نہ تھا
اس لئے وہ خیال خواہش کی حد سے آگے نہ بڑھا۔ مگر شہر کے حکام اور
عمائدین اب بھی زیادہ تر مخالف تھے۔ بعض تو ذاتی
طور پر ناراض تھے اور بعض محض سُنی سُنائی باتوں پر ایمان لائے تھے پھر
یہ گنتی بڑی ہی مستقل وجہ شکایت کی تھی کہ اس نے جو کچھ کیا تھا اس میں ان کی
امداد اور سرپرستی شامل نہ تھی! بعض کو یہ بھی احساس تھا کہ ہم نے اس کا
ساتھ نہ دینے میں غلطی کی ہے اور چونکہ اتنی اخلاقی جرأت نہ تھی کہ اس
غلطی کا اعتراف کرتے اس لئے یہ غصہ بھی ڈاکٹر ہی پر اتارتے تھے جب کوئی
شخص ہمیں بتائے کہ تم غلطی پر ہو اور اتفاق سے اس کی بات صحیح ثابت

ہو جائے تو اس کا نتیجہ اکثر یہی ہوتا ہے! اس مخالفت کے اظہار کا انجمن ایک
اور موقع ملا جب ڈاکٹر نے دیکھا کہ محلّے کی حالت بہت کچھ سدھر گئی ہے تو
اس نے ایک خط کمیٹی کے صدر کو لکھا اور اس کی نقل ہر ممبر کے پاس بھیجی :-

"جناب من تسلیم"

بعض مقامی احباب کی ذاتی کوشش سے حفظانِ صحت کی خاطر تیلیو
کے محلّے میں بعض ضروری انتظامات کئے گئے ہیں جن کی تفصیل منسلکہ رپورٹ
کے مطالعے سے معلوم ہوگی۔ میں درخواست کرتا ہوں کہ آپ کمیٹی کی طرف
سے چند صاحبان کو مقرر کر دیں کہ وہ ان انتظامات کا معائنہ کر کے ان کے
متعلق آپ کے سامنے اپنی رپورٹ پیش کریں اور اگر آپ کی رائے میں
یہ کام مفید اور مناسب ہے تو آپ اسے آیندہ کے لئے اپنی نگرانی میں
لے لیں تاکہ اس کو باقاعدہ اور مستقل طور پر چلایا جا سکے۔

میں ہوں جناب کا خادم

علی حسین

اپنی ذات کے متعلق ایک لفظ نہیں! اور خط بھیجنے میں مصلحت یہ بھی
کہ اگر اتفاق سے وہ اس تجویز پر راضی ہو گئے تو انھیں مجبور ہو کر بعد میں
دوسرے محلوں میں بھی ایسے ہی انتظامات کرنے پڑیں گے۔ لیکن ان پتھروں
میں حرکت پیدا کرنے کے لئے حجت اور دلیل بے سود تھی اس کے لئے

ہتھوڑے کی چوٹ بھی کافی نہ تھی بلکہ کسی زبردست زلزلے کی ضرورت تھی جو ان کی بنیادوں تک کو ہلا دے۔ خط کا کوئی جواب نہیں دیا گیا لیکن جمود اور حماقت نے قانون کی مدد اور مشورہ حاصل کر کے کمیٹی کے صدر کی طرف سے ڈاکٹر پر ایک نوٹس دائر کر دیا کہ تم نے بغیر کمیٹی کی اجازت کے پبلک سڑکوں اور راستوں اور کنوؤں وغیرہ کے انتظام میں مداخلت کی ہے کیا وجہ ہے کہ دفعہ فلاں کی رو سے تم پر مقدمہ نہ چلایا جائے۔ جس وقت یہ نوٹس ان کے پاس آیا سید محمدؐ بھی وہیں موجود تھا۔ اس نے مسکرا کر نوٹس اس کو دیا اور کہا "خدا کا شکر ہے کہ اس نے ان لوگوں کو میرے قابو میں دے دیا۔ ان کو ایسا جواب دوں کہ یاد رکھیں"۔ اس نے اُٹھکر میز کی دراز میں سے کمیٹی کے صدر کا ایک پُرانا خط نکالا اور ایک کاغذ پر دو سطر میں لکھکر اسے نوٹس کے ساتھ نتھی کیا اور سید محمدؐ کو جواب دکھا کر ڈاک کے ذریعے روانہ کر دیا کہ جواب یہ تھا:۔

"بہ جواب نوٹس نمبر۔ مورخہ۔ گزارش ہے کہ یہ ایک آزادی کا زمانہ ہے اور کمیٹی کسی مجبور نہیں کر سکتی کہ وہ گندگی اور غلاظت اور بیماریوں کے اندر زندگی بسر کرے۔

خادم:۔ علی حسین

اِدھر یہ چوٹیں ہو رہی تھیں اور اُدھر محلے کی تنظیم کا کام دن بدن

ترقی پر تھا اور کیوں نہ ہوتا خلوص اور نیک نیتی کی کوششیں بیکار نہیں جاتیں۔
اور لطف یہ تھا کہ اس میں بہت سی نئی شاخیں اور شعبے نکلتے آتے تھے جن سے
ڈاکٹر کو براہ راست کچھ تعلق نہ تھا اور جن کا اسے ابتدا میں خیال بھی نہ تھا۔
اس قسم کا اصلاحی کام ایسا ہوتا ہے جیسے بھرے دریا میں کوئی پتھر پھینک دے۔
اس سے ایک لہر اٹھتی ہے وہ پھیلتی ہے، دوسری اٹھتی ہے وہ پھیلتی ہے
اور اسی طرح لہروں کا ایک سلسلہ بندھ جاتا ہے۔ خدا جانے وہ کہاں جا کر ختم ہو؟
ڈاکٹر نے محض حفظان صحت کی تدابیر اختیار کی تھیں۔ لوگوں کو اس کی بدولت
احساس ہوا کہ اتفاق اور متحدہ کوشش میں کس قدر قوت اور برکت ہے۔
انھیں بہت سی نئی باتیں سوجھیں۔ جو لوگ صاف ستھرے مکانوں میں
رہیں گے ان کو دماغ کے جالے کیوں پسند آئیں گے انھیں اور زیادہ واقفیت
حاصل کرنے کا شوق ہوگا۔ انھیں بچوں کی تعلیم اور عورتوں کی تندرستی کی فکر
ہوگی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی مہینے کے اندر انھوں نے مختلف طریقے اپنی اصلاح
کے لئے اختیار کئے۔ بچوں کو مدرسے بھیجنے کی ضرورت محسوس کی۔ عورتوں کی
تفریح اور تعلیم کا کچھ سلسلہ شروع کیا۔ ایک کے بجائے دو تین مدارس شبینہ
قائم ہوگئے اس میں ڈاکٹر کی پارٹی کے بعض ممبروں نے بہت آمادگی سے
ان کا ساتھ دیا اور اپنی طرف سے اور تجویزیں پیش کیں۔ پنچایت نے محلے
کے بیکاروں اور فقیروں کو کام پر لگانے کی فکر کی اور ان میں سے بعض کو صنعتی

پر اور بعض کو دوسرے مناسب کاموں پر لگایا گیا۔ وہ محلہ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کریم نگر کے خرابے میں کوئی چراغ جل رہا ہو یہ لوگ اب بھی اسی طرح غریب تھے۔ محنت مزدوری کرتے تھے۔ علم کی روشنی سے بہت کچھ محروم تھے لیکن ان کی زندگی جانوروں کی سی زندگی نہ تھی۔ انھیں پہلی مرتبہ عملی تجربے سے یہ محسوس ہوا تھا کہ ان کی گردن میں بدقسمتی کا بھاری پتھر بندھا ہوا نہیں ہے بلکہ وہ مل جل کر اور انتظام سے کام کریں تو بہت کچھ کر سکتے ہیں اور یہی احساس ترقی کی جان ہے۔

(۷)

ان پتھروں میں حرکت پیدا کرنے کے لئے کسی زبردست زلزلے کی ضرورت ہے جو ان کی بنیادوں تک کو ہلا دے"! قدرت کریم نگر کے لوگوں کی حالت پر ہنس رہی تھی اور نہایت اطمینان کے ساتھ اس زلزلے کی تیاری میں مصروف تھی جو ان کی "تقدیر پرستی"، اور "قناعت"، ان کی بے حسی اور خود غرضی کی جڑیں ہلا دینے والا تھا۔ لیکن وہ اس سے ایسے بے خبر تھے جیسے آتش فشاں پہاڑ کے دامن میں رہنے والے اس ہلاکت کی طرف سے غافل ہو جاتے ہیں جو ہر وقت ان کے پڑوس میں سوتی رہتی ہے۔ وہ چاروں طرف سبزہ لہلہاتا دیکھتے ہیں، پھولوں کے حسن سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور یہ بالکل بھول جاتے ہیں کہ فطرت کے اس تبسم

کے پیچھے دوزخ کی قوتیں اور ہلاکت کے بھوت گھات میں بیٹھے ہیں کہ اشارہ ہو اور ان بے خبر انسانوں کا گلا دبا لیں۔ اس سال کریم نگر کی بالکل یہی حالت ہے۔ برسات ابھی ختم ہوئی تھی بارش نے قصبے کی بدصورتی اور داغ دھبوں پر جادو کا ہاتھ پھیر دیا تھا بنجر زمینیں سبزہ زار اور میلے کے ڈھیر تھوڑی سی مدت کے لئے چمن بن گئے تھے۔ باغوں اور کھیتوں، چرندوں اور پرندوں میں جان سی پڑ گئی تھی۔ لوگ انجام سے بے خبر ساون منا رہے تھے جیسے کچھ عرصہ کے لئے فطرت کی دلفریب کشش نے انہیں روزمرہ کی مصیبتیں اور بے رنگ اور بے مزہ زندگی بھلا دی ہو۔

سب لوگ مگن تھے پر رنگ ناخدا کا کچھ فق سا ہو رہا تھا۔ بارش بند ہوتے ہی گرمی بڑھ گئی تھی۔ جا بجا گڑھوں میں پانی بھرا ہوا تھا۔ لیکن گزشتہ چند روز سے ڈاکٹر علی حسین کی تگ و دو زیادہ ہو گئی تھی۔ موسم کی حالت دیکھکر اس کا ماتھا ٹھنکا تھا اس نے اپنے محلے میں خورد و نوش کی چیزوں کی روک تھام اور نگہداشت زیادہ کر دی تھی اور لوگوں کو نہایت سختی سے تاکید کی تھی کہ وہ صفائی کا خیال رکھیں اور باہر والوں کو محلے میں چیزیں بیچنے سے منع کر دیں۔ اسے اندیشہ تھا کہ یہ موسم ہیضے کے لئے بہت سازگار ہے۔ اور اس کا اندیشہ صحیح نکلا!۔

اول اول کہیں کہیں اکا دکا واقعات اس کے علم میں آئے لوگوں نے

انھیں بدہضمی پر محمول کیا اور ان کی طرف چنداں اعتنا نہ کی۔ ڈاکٹر نے ابتدا میں انھیں ڈرانا مناسب نہ سمجھا لیکن احتیاط کی تاکید کی اور حسن اتفاق سے لوگ صحت یاب ہو گئے لیکن چند ہی روز میں تمام محلوں میں بیماری پھیلنی شروع ہوئی اور موت کے فرشتے نے آہستہ آہستہ اطمینان کے ساتھ اپنا کام کرنا شروع کیا۔ ڈاکٹر بشن چند اور ان کے سٹاف کو پہلے آٹھ دس روز تو معاملے کی اہمیت کا اندازہ ہی نہیں ہوا اور علی حسین کی احتیاط اور پریشانی کی انھوں نے ہنسی اُڑائی کہ خواہ مخواہ لوگوں میں پریشانی پیدا کر رہا ہے لیکن جب ایک ایک روز میں دس بارہ موتوں کی نوبت پہنچی تو ان کے ہوش و حواس پریشان ہوئے اور انھوں نے گھبرا کر اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ شروع کی لیکن حفظ ما تقدم کا وقت گزر چکا تھا اور اب بہت کچھ تقدیر کا معاملہ تھا کہ کوئی مریض بچتا ہے یا نہیں۔

کریم نگر کے باشندوں کی یاد میں پہلے بھی تین چار مرتبہ ہیضہ پھیلا تھا لیکن ایسا خدا کا غضب کبھی نازل نہیں ہوا تھا۔ اموات کی تعداد روز بروز زیادہ ہونی شروع ہوئی۔ دس سے پندرہ اور پندرہ سے بیس اور ہوتے ہوتے ایک دن میں پچاس موتوں تک نوبت پہنچ گئی۔ بعض خاندان بالکل تباہ ہو گئے۔ جگہ جگہ یہ عالم تھا کہ ایک ہی وقت میں گھر کے سارے لوگ بیمار پڑے ہیں اور کوئی تیمارداری کرنے والا نہیں، دوا دینے والا نہیں، حلق میں پانی چوانے والا نہیں۔ باوجود اسپتال کا اسٹاف زیادہ ہو جانے اور ان لوگوں کی بھاگ دوڑ

کے بہت سے لوگ سسک سسک کر مر گئے اور ان کو طبی امداد بھی نہیں پہنچ سکی۔
بعض لوگ جن کا دل ان کے ایمان سے بھی زیادہ کمزور تھا شہر چھوڑ کر بھاگ گئے۔
لیکن ان کی تعداد کم تھی۔ باقی یا تو گھر چھوڑ کر کہیں جا ہی نہ سکتے تھے کہ ان تنگ و
تاریک کوٹھریوں کے علاوہ خدا کی وسیع زمین پر ان کا کوئی ٹھکانا ہی نہ تھا یا یہ
سمجھتے کہ وبا زدہ مقام کو چھوڑ کر بھاگنا مشیت الٰہی کی مخالفت اور گناہ ہے۔
جس طرح بچے دکھ میں ماں کو یاد کرتے ہیں، اسی طرح خدا کے بھولے ہوئے بندوں
نے دوبارہ اس سے لو لگائی۔ بازار ویران اور مسجدیں اور مندر آباد ہو گئے۔
دن میں تو کچھ لوگ روزی کی مصیبت کے مارے کام کاج کرنے یا اسپتال
اور ڈاکٹروں کے گھروں کا طواف کرتے دکھائی دیتے تھے لیکن رات کو
سویرے ہی سے شہر پر قبرستان کی سی ویرانی اور بھیانک اداسی چھا جاتی تھی۔
زندگی کا ثبوت اسی وقت ملتا تھا جب رات کی تاریکی میں لوگ جنازے
کندھوں پر اٹھائے قبرستان جاتے دکھائی دیتے۔ کوئی اپنے عزیز اور پیارے
کو آسودۂ خاک کرنے جاتا تھا۔ کوئی کسی بے یار اور کس مپرس غریب کی انسانی
خدمت انجام دینے! ان کے چہروں پر رنج اور غم سے بھی زیادہ پریشانی اور
تکان کے آثار تھے۔ جب موت کا بازار چاروں طرف گرم ہو اور گلیوں اور
سڑکوں پر زندوں سے زیادہ مردے چلتے پھرتے دکھائی دیں تو احساس کی
قوت کند پڑ جاتی ہے اور طبیعت پر تکان، مایوسی اور زندگی سے بیزاری

غالب آجاتی ہے۔ ایسی بے اندازہ تکان جس کے بعد ایک ہی خواہش ہو اور وہ یہ کہ کسی طرح اپنا سرِ شوریدہ بھی بالائے آسایش پہنچ جائے۔

اور ڈاکٹر علی حسین؟ وہ شخص بالکل فولاد کی مشین بن کر رہ گیا تھا جس کو نہ کھانے کی ضرورت ہوتی ہے، نہ پینے کی، نہ سونے کی پروا، نہ آرام کی فکر۔ سپیدۂ سحر شام کے دھندلکے میں تبدیل ہو جاتا اور شام کا دھندلکا سپیدۂ سحر میں لیکن اس کے پاؤں کا چکر بند نہ ہوتا تھا۔ جہاں کہیں موت کا فرشتہ دروازے سے جھانکتا وہاں یہ بھی فرشتۂ رحمت بنکر پہنچ جاتا اور ایک ایک مریض کے لئے اس سے جنگ کرتا اور اکثر زندگی کے بجھتے ہوئے چراغ میں تیل ڈالکر اس کے منہ میں سے اس کا شکار نکال لیتا۔ دوا سے زیادہ اس کی اثر آفرینی کام کرتی تھی۔ وہ ہر ایک مریض کو یقین دلاتا کہ ہیضہ نہایت معمولی بیماری ہے اور تھوڑی سی احتیاط اور ہمت سے اس کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ بہت سے لوگ اپنی بزدلی اور ناواقفیت کی وجہ سے بیماری سے جنگ ہی نہیں کرتے۔ خصوصاً ایسے خوفناک زمانے میں ان کے اوسان بالکل خطا ہو جاتے ہیں، زندگی پر ان کی گرفت ڈھیلی ہو جاتی ہے اور وہ اسی کو ہاتھو سے چھوڑ کر موت کے استقبال کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں دوا کا اثر ہونا بہت مشکل ہے۔ علی حسین ان کی ہمت اور استقلال کو مستحکم کرتا تھا ان کی خواہشِ حیات کو تازہ کرتا تھا۔ انسان کی ذات میں ایسی ایسی

قوتیں مخفی ہوتی ہیں جن کا خود اسے بھی پورا اندازہ نہیں ہوتا۔ وہ انھیں
زندگی اور موت کی اسی جنگ میں اپنی طرف ملا لیتا تھا۔ اسکی خوش مزاجی،
خود اعتمادی اور خلوص اثر کئے بغیر نہ رہے تھے۔ مریض اس کی راہ اس طرح
تکتے تھے جیسے کوئی تازہ ہوا یا ٹھنڈے پانی کے لئے بیتاب ہو اور اس
میں امیر غریب، ہندو مسلمان، مرد عورت، بڑے بچے کسی کی تخصیص نہ تھی
اس کی توجہ اور ہمدردی ہر شخص کے لئے وقف تھی کہ جو بیمار ہو اور اس کی امداد
کا محتاج ہو۔ اسے یہ احساس بالکل نہ تھا کہ شہر میں بہت سے لوگوں نے
اس کی مخالفت کی تھی۔ ان سب کی خدمت بھی اس نے اس جانفشانی اور
خلوص سے کی جس طرح اپنے دوستوں کی اور وہ لوگ بھی بالکل بھول گئے تھے
کہ انھوں نے کس طرح اس کی تجویزیں ٹھکرائی تھیں اور اس کے راستے میں
روڑے اٹکائے تھے۔ کھانے کے وقت پانچوں انگلیاں برابر ہو جاتی ہیں اور
موت کا منہ دیکھکر آدمی سب برابر ہو جاتے ہیں۔ ایسے وقت میں
اکثر رنگ اور مذہب اور دولت کے امتیازات اس طرح ڈھل جاتے ہیں
جیسے کسی نے پانی سے اپنے چہرے کو دھو کر اس پر سے کوئی سستا پوڈر
دور کر دیا ہو۔ وہی تحصیلدار صاحب جو اس سے ملنے تک کے روادار نہ تھے
اب اسی کا دم بھرتے تھے ان کی رعونت اور بندگی کا احساس کم ہو گیا تھا۔
ایک لڑکے کو نذر اجل کر چکے تھے اور دوسرے کی زندگی کے لئے علی حسین

کے مرہونِ منت تھے۔ بشن چند کی مخالفت اور ناراضگی بھی ختم ہو چکی تھی اب وہ اس بات کے لئے بالکل تیار تھا کہ علی حسین کے کہنے پر چلے اور اس کے ساتھ مل جل کر کام کرے۔ اس بندہ خدا کو اور کیا چاہیئے تھا؟ اسے تو کام ٹھیک ہونے سے مطلب تھا اس نے فوراً اپنی خدمات اس کے سپرد کر دیں اور کہا کہ جس طرح آپ کہیں میں کام کرنے کو تیار ہوں اور اس طرح بظاہر اس کا ماتحت بن کر اس نے بیماری کا مقابلہ کرنے کے لئے ہر قسم کے انتظامات کرائے اور شہر کو مزید تباہی سے بچا لیا۔

اس قیامت کے مہینے میں جب کریم نگر اور اس کے قرب و جوار میں موت کی گرم بازاری تھی علی حسین کی کامیابی کا سب سے بڑا ثبوت جس نے پتھروں کو بھی اپنی جگہ سے ہلا دیا یہ تھا کہ تیلیوں کا محلہ اس وبا سے تقریباً محفوظ تھا اس نے وہاں احتیاط اور حفاظت کے خیال سے گویا مارشل لا جاری کر دیا تھا۔ چونکہ گزشتہ چند مہینے میں بہت سے کام کرنے والے رضا کار تیار ہو چکے تھے اس لئے ان کی مدد سے ہر چیز کی سخت نگرانی کی جاتی تھی تاکہ کنوؤں میں اور کھانے پینے کی چیزوں میں متعدی اثرات نہ پہنچنے پائیں۔ چنانچہ اس محلے میں کچھ لوگ بیمار پڑے لیکن علاج اور احتیاط کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں صرف دو موتیں ہوئیں۔ مگر یہ روشنیِ طبع ان لوگوں کے لئے بلا ہوتے ہوتے رہ گئی۔ جب لوگوں نے یہ دیکھا کہ اس محلے میں مقابلتہً امن و امان ہے تو انھوں نے

یوں بے تحاشا اس کی طرف رجوع کیا کہ جیسے پانی نشیب کی طرف بہتا ہے۔

اس وقت علی حسین بہت پریشان ہوا۔ اگر اس کا کوئی تدارک نہ ہوا تو بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا اور سال بھر سے زیادہ کی محنت مٹی میں مل جائے گی۔ اپنی ذمہ داری پر وہ اس معاملے میں کچھ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اگر لوگوں کو بے روک ٹوک آنے دیا جائے تو ان کو کوئی فائدہ نہ ہوگا اور یہ غریب بھی اسی مصیبت میں گرفتار ہو جائیں گے۔ (اور اسے یہ خیال بھی نہیں گزرا کہ وہ سب اسی کو الزام دیں گے!) اگر ان کو روکنے کی کوشش کی گئی تو اول تو کامیابی محال، دوسرے بیماری کے ستائے لوگ ایسے بے رحم اور سنگدل ڈاکٹر کو زندہ نہ چھوڑیں گے پھر یہ اندیشہ بھی تھا کہ خود اس کے محلے والے کہیں گے کہ تم نے سارے شہر سے ہماری ممانعت کرا دی اور ہمیں ان سے معمولی انسانی ہمدردی بھی نہ کرنے دی! یعنی بحث میں تو جیت بھی ان کی ہوگی اور پٹ بھی ان کی، اور ہر صورت میں نقصان ہی نقصان! اب کیا کیا جائے؟ میں نے پنچایت کا جلسہ کرایا اور ساری کیفیت بے کم و کاست بیان کر دی۔ بڑی دیر تک بحث و مباحثہ ہوا کیا۔ اس میں ان غریب اور جاہل لوگوں نے بھی عالم اور ہوشیار سوفسطائیوں کی طرح یہ کوشش کی کہ کسی طرح کوئی ایسی صورت نکالیں کہ ان کی جان بھی جوکھوں میں نہ پڑے اور کوئی یہ بھی نہ کہہ سکے کہ انھوں نے انسانیت اور ہمدردی سے گریز کیا! ڈاکٹر نے ہوشیاری سے گفتگو کا رُخ پھیرا اور آخر میں

خود ان لوگوں کے ایما سے یہ طے ہوا کہ محلے میں دو مکان مردوں کے لئے اور دو عورتوں کے لئے خالی کر دئے جائیں۔ ان میں سے ایک ایک مکان میں باہر کے مریض مرد اور عورتیں رہیں اور باقی دو میں تندرست لوگ جو پناہ گزین ہوتا چاہیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا لیکن ڈاکٹر نے یہ شرط نہایت سختی سے لگادی تھی کہ جو شخص اس کے مشورے اور ہدایت پر عمل نہ کریگا اُس کو محلے سے نکال دیا جائیگا اور جو شخص بیمار پڑے گا اُس کو مریضوں والے مکان میں رہنا پڑیگا۔ کوئی مریض تندرستوں کے ساتھ نہ رہ سکے گا۔ ہمدردی، محبت اچھی چیزیں ہیں لیکن اگر عقل بھی ان کے ساتھ استعمال کی جائے تو بہتر ہے! چنانچہ اس نے نہایت پابندی کے ساتھ اس شرط کو قائم رکھا اور ایک دو آدمیوں کو جنھوں نے خفیہ طور پر اسے توڑنا چاہا محلے سے باہر نکال دیا کہ میں تمھاری خاطر کئی سو آدمیوں کی جان خطرے میں ڈالنے کو تیار نہیں ہوں۔ جب مریضوں اور پناہ گزینوں کی تعداد اور زیادہ ہوئی تو ان لوگوں نے چاروں مکان کو مریضوں کے لئے خالی کر دیا اور ادھر اُدھر سے چند خیمے مہیّا کرکے تندرستوں کے لئے لگا دئے۔ گویا اس طرح سرکاری اسپتال کے علاوہ ایک عارضی اسپتال اور قرنطینہ اور قائم ہوگیا جہاں علی حسین کے انتظام کی بدولت ہر کام زیادہ باقاعدگی سے ہوتا تھا۔ دوائیں اور دو کمپاونڈر شین چند نے ان کے پاس بھیجدیئے لیکن زیادہ مدد اسے بہت سے رضاکاروں سے ملی جنہوں نے ایثار اور عملی ہمدردی کے اس زندہ نمونے

سے متاثر ہو کر اپنی خدمات اس کے سپرد کر دی تھیں۔ وہ اس دار و گیر کے عالم میں انھیں باقاعدہ تعلیم نہ دے سکتا تھا اس لئے جلدی جلدی ہدایات دے کر انھیں کام پر لگا دیتا تھا۔ علم اور تجربے کی کمی کبھی کبھی محنت اور خلوص اور عمدہ نگرانی کے ذریعے بھی پوری ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ان لوگوں نے علی حسین کی دیکھا دیکھی دن رات کو ایک کر دیا اور ہر طرح سے مریضوں کی خدمت کی۔ ان میں بڑی عمر کے لوگ بھی تھے اور سکول کے طالب علم بھی۔ غریبوں کے بچے بھی تھے اور راہبروں کے بچے بھی جن میں سے بعض باوجود اپنے والدین کی مخالفت کے وہاں پہنچ گئے تھے۔ مثال اور نمونہ بھی بیماری کی طرح متعدی ہوتا ہے اور ان سب نے بھی اس فضا میں رہکر چند ہی دن میں یہ کہنا سیکھ لیا: "ہوں موت کا کیا ڈر ہے ایک ہی دفعہ تو آتی ہے اگر کسی اچھے کام میں آئے تو کیا برا ہے"۔ اور اس کا اثر صرف مردوں ہی تک محدود نہیں رہا بلکہ تیمارداری کی خدمت کے لئے عورتیں بھی تیار ہو گئیں، جس سے ڈاکٹر کو بہت زیادہ مدد ملی کیونکہ عورت کی فطرت میں تیمارداری کا مادہ ہی اور اس کی طبیعت کے بعض بہترین جوہر اس وقت ظاہر ہوتے ہیں جب وہ ماں بنکر کسی کے دکھ درد میں شریک ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک مہینے بھر تک تیلیدل کا محلہ شہر کے بہترین لوگوں اور نوجوانوں کا مرکز اور آماجگاہ بنا رہا۔ لوگ اس انتظام اور سلیقے اور باقاعدگی کو دیکھتے تھے کہ کئی سو آدمی شہد کی مکھیوں کی طرح

چپ چاپ مستعدی کے ساتھ اپنے کام میں مصروف ہیں اور تعجب کرتے تھے
کہ یہ اسی کریم نگر کے باشندے ہیں جہاں سینکڑوں برس سے انتشار اور بدنظمی
اور کم ہمتی چھائی ہوئی تھی ایک دفعہ تو دیوبالسن کلبی بھی اس منظر کو دیکھکر سوچ میں
پڑجاتا کہ اس نے انسانوں کے متعلق جو اپنا نظریہ قائم کیا ہے وہ صحیح ہے یا غلط!

اسی دوران میں دو تین مرتبہ ضلع کا سول سرجن اور ایک مرتبہ صحت عامہ
کا افسر اعلیٰ بھی کریم نگر کا معائنہ کرنے آیا اور معائنے کے دوران میں علی حسین سے ملاقات
ہوئی۔ حسن اتفاق سے یہ دونوں افسر سمجھدار اور مردم شناس تھے۔ اس کا انتظام
اس کی محنت اور اس کے محلے کی حالت دیکھکر وہ بہت متاثر اور متعجب ہوئے
اور اس سے شہر کے متعلق بڑی دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ انھوں نے اس سے
دریافت کیا کہ اس مرتبہ ایسی شدید وبا کیوں پھیلی۔ اس نے بغیر کسی شخص پر
الزام لگائے انھیں بتایا کہ شہر میں صفائی کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ آج کل تو پھر
غنیمت ہے کیونکہ عارضی طور پر صفائی کا زیادہ انتظام ہے۔ ورنہ بالعموم یہ انسانوں
کی بستی مرغیوں کا ڈربہ معلوم ہوتی ہے۔ ان کی دلچسپی اور توجہ کو دیکھکر اس
نے انھیں اپنے پرانے چارٹ اور نقشے وغیرہ بھی دکھائے اور کہا کہ ایسی
صورت میں بیماری کا نہ پھیلنا معجزہ تھا اور پھیلنا معمولی بات ہے۔ ڈائرکٹر
نے پوچھا تم نے یہ سب باتیں یہاں کے حکام کو کیوں نہیں بتائیں۔ اس نے
کمیٹی کے ساتھ جو خط و کتابت ہوئی تھی اس کا حال سنایا اور کہا کہ میرے

کہنے کا ان پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ شاید خدا کو منظور یہ تھا کہ لوگ اس آگ میں
سے گزرنے کے بعد اصلاح کی طرف مائل ہوں۔ وہ یہ سُن کر مسکرایا اور کہا
کہ میں اس معاملے پر غور کروں گا۔ چند ہی دن بعد اس نے ڈاکٹر علی حسین کو
لکھا کہ تم اپنے تمام کاغذات سمیت آکر مجھ سے ملجاؤ۔ اس وقت بیماری کا زور
ٹوٹ چکا تھا ڈاکٹر کو ذرا فرصت تھی۔ وہ وہاں پہنچا اور ڈائرکٹر نے بہت
دیر تک اس سے بات چیت کی، تمام نقشوں کو دیکھا بھالا۔ بہت سے
سوالات کیئے گویا اس کو ٹٹولنا مقصود ہے۔ لیکن علی حسین ہر طرح تیار تھا
ہفتوں کی محنت کا نتیجہ یہ تھا کہ اس کی مسل بالکل مکمل تھی اسے ہر معاملے پر
پورا عبور تھا مطمئن ہو کر اس نے کہا "اچھا تم قصبے کے متعلق ایک سائنٹفک اسکیم تیار
کر کے کمیٹی کے سامنے بھیجدو۔ باقی معاملہ میں خود سمجھ لوں گا" جب یہ روانہ ہونے
لگا تو اس نے اُسے روک کر پوچھا کہ ڈاکٹر صاحب اگر گورنمنٹ آپکو سرکاری نوکری
میں لینا چاہے تو آپ راضی ہو جائیں گے۔ جواب دیا "شکریہ لیکن میں
سرکاری نوکری نہیں کرنا چاہتا۔ اس سے میری آزادی میں فرق آجائے گا
اور میں اپنا کام حسب دلخواہ نہیں کرسکونگا" وہ یہ سُن کر ہنسا اور کہنے لگا۔
"مجھکو آپ سے اسی جواب کا اندیشہ تھا خدا حافظ"

(۸)

علی حسین نے واپس آکر فوراً اپنی سکیم تیار کی اور اس کو کمیٹی کے صدر کے

پاس روانہ کر دیا۔ پچھلے سال کا زمین و آسمان بدل چکا تھا۔ اب علی حسین ایک خبطی نوجوان نہ تھا بلکہ ایک کامیاب ڈاکٹر تھا جس کی قابلیت کا اعتراف صوبے کے سب سے بڑے افسر نے کیا تھا۔ کمیٹی کے بہت سے ممبر جو پہلے اس کے ذکر پر تیوری چڑھاتے تھے اب اس کے نام کا کلمہ پڑھتے تھے۔ واقفیت اور ملاقات نے خواہ مخواہ کی مخالفت اور تعصب کی دھند دور کر دی تھی۔ تیلیوں کا محلہ اس کا جیتا جاگتا کارنامہ سامنے موجود تھا اور شہر کی ویران اور ابتر حالت اس کی پیشین گوئی کی صداقت کر رہی تھی۔ سب سے زیادہ یہ کہ شہر کے ہر چھوٹے بڑے کے دل پر اس کی انسانیت اور ہمدردی اور لیاقت کی مہر تھی۔ کریم نگر جس آگ میں سے ہو کر نکلا تھا اس نے اس کی فطرت کے سونے کو کندن بنا کر چمکا دیا تھا۔ اب وہ اس کی تجویزوں کو جنون نہ سمجھتے تھے بلکہ انتہائی دور اندیشی پر مبنی۔ لہٰذا وہ لوگ ان کو منظور تو کرتے ہی لیکن اسی دوران میں ایک خط ڈائرکٹر کا ان کے پاس پہنچا کہ اگر وہ بہت جلد قصبے کی حالت کو درست نہیں کریں گے اور آیندہ بیماری کے خلاف ہر ممکن طریقے سے روک تھام نہ کریں گے تو گورنمنٹ کمیٹی کو معطل کر دے گی۔ چنانچہ صورت ایسی آپڑی کہ شکر گزاری، دانش مندی، دیانت داری اور خوف سب کا تقاضا یہی تھا کہ سینکڑوں برس کی گومگو پالیسی کو ترک کر کے شہر کو گویا نئے سرے سے بنایا جائے اور بجلی، پانی، سڑکوں کی مرمت وغیرہ کے متعلق تجاویز

طاقِ نسیاں میں ڈال دی گئی تھیں ان کو دوبارہ جھاڑ پونچھ کر کام میں لایا جائے لیکن پہلا کام یہ تھا کہ ڈائرکٹر کے اعلان جنگ کا مناسب جواب بھیجا جائے اور اس کے لئے ڈاکٹر بشن چند کی ضرورت تھی جو اس ہیضے کے ذمہ دار تھے۔ ان کی رائے کے بغیر جواب بھیجنا مناسب نہ تھا لیکن نہ معلوم کیوں وہ اس جلسے میں موجود نہ تھے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ان کی طبیعت کچھ سُست ہے وہ نہیں آسکیں گے۔ چنانچہ جلسہ عام بحث و مباحثہ کے بعد اس روز ملتوی کر دیا گیا کہ ڈاکٹر کی موجودگی میں باقاعدہ تجاویز پاس کی جائیں گی۔

ہوا یہ تھا کہ ڈاکٹر بشن چند خود بیمار پڑ گئے تھے ان پر ہیضے کا حملہ ہوا تھا اور وہ کئی ہفتے کی محنت اور بھاگ دوڑ کے بعد بستر علالت پر آرام لے رہے تھے علاج ہو رہا تھا اور بظاہر کسی قسم کے اندیشے کی بات نہ تھی۔ چوتھے روز ان کی علالت کی خبر علی حسین کو ملی چونکہ وہ دو ایک مریضوں کے علاج میں مصروف تھا جن کی حالت ذرا نازک تھی اس لئے اسے فرصت نہ ہوتی تھی کہ لوگوں سے ملے جلے اور اسی وجہ سے اس سے قبل بشن چند کی بیماری کی خبر نہ ملی تھی۔ اب اطلاع پاتے ہی وہ فوراً ان کے گھر پہنچا اور بہت غور اور احتیاط سے ان کا معائنہ کیا حالت دیکھ کر اس کی پیشانی پر فکر کے بل پڑ گئے۔ بیماری کا راستہ نہ صاف اور سیدھا نہ معلوم ہوتا تھا بلکہ اس میں کچھ پیچیدگیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ اس نے فوراً علاج اور تیمارداری کو تمام تر اپنے ہاتھوں میں

لے لیا اور اس وقت تک قصبے میں اس کی پوزیشن اس درجے مستحکم ہو چکی تھی کہ کسی نے کوئی تعرض نہیں کیا۔ اس اللہ کے بندے نے ہفتے بھر تک اپنے پر خورونوش اور خواب کو تقریباً حرام کر لیا کیونکہ اسے ہر وقت چوکنا رہنا پڑتا تھا نہ معلوم بیماری کس وقت اور کس مقام پر وار کرے اور اس کا توڑ کرنے کی ضرورت ہو اس کی اپنی جسمانی قوت تقریباً جواب دے چکی تھی لیکن ارادے کی پختگی نے اس کو سنبھالے رکھا۔ رنگ زرد تھا اور آنکھوں میں حلقے لیکن آواز میں وہی بشاشت، آنکھوں میں وہی عزم، دماغ میں وہی تیزی جیسے کوئی آزمودہ کار جرنیل کسی زبردست حریف کی چالیں دیکھ رہا ہو اور ایک ایک کا تدارک کر رہا ہو۔ چھٹے روز اس نے لبش چند کے انجکشن لگایا اور اس کا اثر دیکھا۔ بارہ گھنٹے کے بعد اسے اطمینان ہوا کہ خطرے کی منزل گزر گئی ہے اور اس نے موت کے منہ سے ایک اور شکار چھین لیا ہی جب لبش چند کے حواس کسی قدر درست ہوئے تو اس نے علی حسین کی حالت دیکھی اور اصرار کیا کہ وہ جا کر آرام کرے اس نے کچھ پس و پیش کیا کیونکہ وہ چاہتا تھا کہ دو روز اور خود تیمارداری کر لے لیکن جب لبش چند کسی طرح راضی نہ ہوا تو وہ مجبوراً گھر لوٹ آیا۔

گھر پہنچتے ہی وہ خود بیمار پڑ گیا۔ اس نے پچھلے سال بھر اپنے مقدور سے زیادہ محنت کی تھی اور خصوصاً گزشتہ چند ہفتے کی جسمانی اور دماغی محنت نے اس کے اعصاب کو بالکل ماؤف کر دیا تھا۔ اس میں کافی جسمانی قوت تھی لیکن اس وبا کے دوران میں اس نے اس کو بے دریغ صرف کیا تھا اور بچائے

سرمائے کا سود کھانے کے اصل سرمائے میں سے بہت بڑا حصہ صرف کر ڈالا تھا اور اس نقصان کی تلافی کی طرف توجہ نہ کی تھی۔ اور اب جبکہ دفعتاً وہ تمام ذمہ داری اور ہنگامہ ختم ہو گیا جس نے ان کو غیر معمولی قوت دیکر اب تک سنبھالے رکھا تھا اسے ایسا معلوم ہوا جیسے جسم کی سکت نکل گئی ہو۔ وہ محض کشن چندر کے اصرار سے آرام کرنے پر رضامند ہوا تھا لیکن اب فطرت نے اپنا انتقام لیا اور اسے بالکل مجبور ہو کر بستر پر دراز ہونا پڑا اسے اپنی ذات کے لیئے دوسروں کو تکلیف دینا اور ان سے ناز برداری کرانا گوارا نہ تھا۔ قوت کی معمولی دوائیں استعمال کیں اور ملنے والوں سے کہدیا کہ تکان بہت ہو گئی ہے اس لیئے ذرا آرام لینا چاہتا ہوں۔ پہلے چند روز واقعتاً آرام سے گزرے اس کے دوستوں کو جب معلوم ہوا کہ طبیعت ناساز ہے تو وہ روز شام کو ملنے آجاتے اور یہ اپنے بستر پر لیٹے لیٹے ان سے باتیں کرتا۔ شہر کے حالات پوچھتا۔ گزشتہ کارروائیوں اور معرکوں پر تنقید ہوتی۔ آئندہ کے لئے نئی تجاویز سوچی جاتیں انھیں معلوم تھا کہ کمیٹی کا رویہ بدل گیا ہے اور وہ سب بہت خوش تھے کہ ان کی ساری محنت اکارت نہیں جائے گی ان کو جنگ میں بہت جلد اور خلاف توقع کامیابی حاصل ہوئی تھی نہ صرف یہ کہ شہر میں بیماری سے امن تھا بلکہ شہر والوں کی ذہنیت بہت کچھ بدل گئی تھی اور یہ بہت بڑا کارنامہ تھا۔ انھیں اطمینان تھا کہ جہالت اور بے حسی کے گھنے اور مخالف جنگل میں جو راستہ انھوں نے کھولدیا ہے وہ

اب وہ بند نہیں ہو گا بلکہ دوست اور دشمن سب اس پر چلیں گے اور اس سے فائدہ اٹھائیں گے ۔

دعائیں دیں گے مرے بعد آنیوالے میری وحشت کو ؎ بہت کانٹے نکل آئے مرے ہمراہ منزل سے

انھیں اور ان کے وفادار ساتھیوں کو حق حاصل تھا کہ وہ معرکہ سر ہونے کے بعد شام کی خاموشی اور امن میں بیٹھ کر ان واقعات پر تبصرہ کریں اور اپنی کامیابی پر تھوڑا سا فخر اور بہت سی خوشی کریں۔

مگر علی حسین کو افاقہ نہ ہوا۔ اس کی طبیعت بگڑتی چلی گئی۔ معلوم ہوتا ہے اس میں قوت مدافعت باقی نہ رہی تھی مضراب کے تاروں پر انکی طاقت سے زیادہ بوجھ پڑا تھا۔ ان کی لچک جاتی رہی اور وہ ٹوٹ گئے۔ جب انسان کے جسم میں زندگی کی لہر دھیمی اور کمزور پڑ جاتی ہے تو بیماری کے جراثیم بھی موقع پا کر جوق جوق اس پر حملہ کرتے ہیں۔ ان کی حالت بھی انسانوں کی سی ہے۔ غنیم کو زبردست پاؤ تو پہلو بچا کر نکل جاؤ۔ کمزور دیکھو تو فوراً دبا لو۔ اور شاید یہ بھی صحیح ہو (جیسا بعض لوگ کہتے ہیں) کہ خدا کی بھیجی ہوئی بیماری سے جنگ کرنا ٹھیک نہیں۔ وہ بھی اپنا انتقام لے کر رہتی ہے! ڈاکٹر علی حسین کو باوجود ہر قسم کی احتیاط کے ہیضہ ہوا اور نہایت شدید ہوا اور باوجود ہر قسم کے علاج کے حالت نہ سنبھلی۔ جب شہر میں یہ خبر عام ہوئی تو ایک کھلبلی سی مچ گئی۔ صبح سے شام تک ان کے دروازے پر لوگوں کا تانتا بندھا رہتا۔ لوگ

اس بے قراری سے اس کا حال پوچھتے جیسے کوئی اپنے نہایت پیارے عزیز کی مزاج پرسی کرتا ہے۔ ہزاروں مرد اور عورتیں، ہندو اور مسلمان دعائیں کرتے۔ خدا ان کے محسن کو بچالے۔ سارے شہر پر ایک اُداسی، پریشانی اور خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ علاوہ شہر کے ڈاکٹروں کے ضلع کا سول سرجن بھی علاج میں شریک تھا۔ ایک مرتبہ ڈائرکٹر ادھر سے گزرتا ہوا ان کی عبادت کے لئے آیا (اسی تیلیوں کے محلے میں!) اور گفتگو کے دوران میں کہا کہ ڈاکٹر تم نے اس شہر کی خاطر اپنی جان کو جوکھوں میں ڈال دیا ہے۔ ڈاکٹر نے مسکرا کر جواب دیا۔ "جناب میں نے کوئی ایسا برا سودا بھی نہیں کیا" اس نے ایک گہری نظر اس کے چہرے پر ڈالی اور دل میں فیصلہ کیا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے سچ کہہ رہا ہے!

اس اثنا میں لشن چند بالکل تندرست ہو گئے تھے کمیٹی کا جو جلسہ ملتوی ہو گیا تھا دوبارہ منعقد کیا گیا اس میں علی حسین کی سکیم اور ڈائرکٹر کا خط پیش کیا گیا اور باتفاق رائے یہ قرار پایا کہ اس سکیم کو تمام وکمال منظور کر لیا جائے اور اس کو کامیابی کے ساتھ چلانے کے واسطے ڈاکٹر علی حسین کی خدمات تین سال کے لئے حاصل کیجائیں تاکہ وہ بطور ہیلتھ آفیسر کے کام کریں اور خود اپنی تصنیف کو عملی جامہ

پہنا ہیں۔ لبشن چند نے نہایت گرم جوشی سے اس تجویز کی تائید کی۔
اس کے بعد ایک ممبر نے یہ تجویز پیش کی کہ کمیٹی کی طرف سے کسی مناسب
صورت میں ڈاکٹر علی حسین کی گراں قدر خدمات کا اعتراف ہونا چاہئے
اور بحث مباحثے کے بعد یہ رائے قرار پائی کہ نیلیوں کے محلے کا نام
محلہ علی حسین رکھا جائے اور شہر کے وسط میں ایک علی حسین
پارک بنایا جائے جہاں عورتیں جا کر سیر و تفریح کر سکیں تاکہ ان کی
صحت بہتر ہو اور دق کا دفعیہ ہو۔ ابھی یہ گفتگو ختم نہیں ہوئی تھی کہ
ایک شخص سراسیمہ اور پریشان کمیٹی کے دفتر پہنچا اور ڈاکٹر لبشن چند
کو بلا کر کہا کہ جلدی چلئے ڈاکٹر علی حسین کی حالت زیادہ خراب ہے۔
وہ فوراً اسی حالت میں بغیر جلسے کی کارروائی ختم کئے وہاں پہنچے
تو دیکھا ــــــ کہ وہ آخری اور خوفناک سایہ جو انسان کے چہرے
پر چھا جاتا ہے آہستہ آہستہ علی حسین پر طاری ہو رہا ہے۔ ان کا
دل بیٹھ گیا انھوں نے سید محمد کو اشارہ کیا کہ تم باہر چلے جاؤ اور خود
اس کے سرہانے جا کر کھڑے ہو گئے اور مصنوعی بشاشت سے پوچھا
"کہئے ڈاکٹر صاحب مزاج کیسا ہے"؟ علی حسین اپنی بے ہوشی سے
چونکا اور اس نے خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا "اب
یہ تماشہ ختم ہے" "ہائیں آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ اتنے بڑے

ڈاکٹر ہو کر آپ اس قدر جلد گھبرا گئے؟ آپ ضرور اچھے ہو جائیں گے۔"

علی حسین نے اپنی گہری اور صاف آنکھیں ڈاکٹر بشن چند کے چہرے پر جمائیں (میرے خدا اس شخص کی آنکھیں میری روح کی گہرائیوں میں اتری چلی جاتی ہیں؟) اور رک رک کر کہا "ڈاکٹر صاحب میں بڑا ڈاکٹر تو نہیں لیکن ڈاکٹر ضرور ہوں زندگی کے آخری لمحے بہت قیمتی ہوتے ہیں جن لوگوں کو سچ کا روشن چہرہ دیکھنے کی تاب ہو انھیں ایسے وقت میں افسانے نہیں سنانے چاہئیں۔ مجھے معلوم ہے کہ میرا آخری وقت آ گیا ہے میں موت سے نہیں ڈرتا زندگی ایک کھیل ہے۔ اس میں حادثات ہوتے رہتے ہیں۔ ان پر کوئی کیوں دل کڑھائے۔ میں خوش ہوں کیونکہ میں اپنی بساط بھر کام کر چکا۔ اب آپ مجھ سے وعدہ کیجئے کہ میرے بعد اس کام کو جاری رکھیں گے۔" بشن چند کا نہ دل قابو میں تھا نہ زبان۔ طبیعت کو بہت روک کر بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"میرے عزیز دوست میں وعدہ کرتا ہوں کہ ایسا ہی ہوگا۔ آپ جب ساری ابتدائی مشکلیں تم جھیل چکے ہو تو ہر معمولی آدمی اسے انجام دے سکتا ہے۔ میں ابھی کمیٹی کے جلسے سے آ رہا ہوں انھوں نے تمھاری تمام سکیم منظور کر لی ہے اور تمھیں ..... (کچھ الفاظ

نگل کر) اور تمھارے محلے کا نام محلہ علی حسین قرار دیا ہے اور عورتوں کے لئے ایک علی حسین پارک بنانا تجویز ہوا ہے"۔ علی حسین نے جیسے ہی سُنا کہ اس کی سکیم منظور ہو گئی ہے اس کا چہرہ بشاش ہو گیا۔ شمعِ حیات نے ایک آخری سنبھالا لیا۔ اس نے بشن چند کو اشارہ کیا کہ برابر کے کمرے سے میرے دوستوں کو بُلا دو۔ جب وہ اندر آئے تو ان سے کہا "میرے دوستو ہمارے پروگرام میں ایک خفیف سی تبدیلی لازم ہو گئی ہے۔ میں اب اس شہر کی خدمت میں تمھارا ساتھ نہ دے سکوں گا۔ میں تمھارا ہاتھ ڈاکٹر بشن چند کے ہاتھ میں دیتا ہوں۔ مجھ سے وعدہ کرو کہ ان کے ساتھ تم اسی طرح وفا داری کے ساتھ کام کرو گے جس طرح میرے ساتھ کیا ہے"۔ آواز تو کس کی نکلتی لیکن ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں نے وہ جواب دیا جس کا اسے انتظار تھا۔ اس نے مطمئن ہو کر آنکھوں آنکھوں میں انکا شکریہ ادا کیا اور پھر قوت نے جواب دیدیا اور اس نے کروٹ بدل لی۔ بشن چند سے ضبط نہ ہو سکا۔ اس نے گلوگیر آواز میں کہا "ہاں کام تو ہو جائے گا لیکن وہ کہاں ہوگا جس نے ہمیں کام کی قدر سے آشنا کیا، جس کے بغیر شہر سونا اور بے لطف ہو جائیگا؟ علی حسین کے ڈوبتے ہوئے حواسوں تک یہ بات پہنچ گئی۔ اس کے گلے سے بہت

آہستہ بہت ڈوبی ہوئی آواز میں یہ الفاظ نکلے "کام اصلی چیز ہے کام کرنے والے کی کوئی اہمیت نہیں۔ روشنی پہچاننا ضروری ہے جب ایک چراغ بجھنے لگے تو اس سے دوسرا جلا لینا چاہیئے۔ شراب اصلی چیز ہی۔ ایک برتن ٹوٹ جائے تو دوسرے ۔ ۔ ۔" اس کی آواز بند ہو گئی، ہمیشہ کے لئے بند ہو گئی۔ اور لچھن چند پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس کے تمام ساتھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے اور جب شہر میں یہ خبر معلوم ہوئی تو لوگوں میں ایک کہرام مچ گیا۔ ایک شخص نے کہا اور اس نے شاید بہت سے لوگوں کے جذبات کی ترجمانی کی ہو "اس بدنصیبی کے مقابلے میں وبا کی مصیبت ہیچ معلوم ہوتی ہے۔"

(۹)

میں گزشتہ ماہ اس کی قبر پر فاتحہ پڑھنے گیا تھا تو میں نے دیکھا کہ کسی نے اس کی لوح پر یہ شعر کندہ کرا دیا ہے:

حاصلِ عمر نثارِ رہ یارے کردم
شادم از زندگیِ خویش کہ کارے کردم

خواجہ غلام السیّدین

پرنسپل ٹریننگ کالج علی گڑھ

روہیلا بک ڈپو کی چند قابل مطالعہ کتابیں

تصانیف مولانا طفیل احمد صاحب (علیگ)

حکومت خود اختیاری اور ہندو مسلم مسئلہ کا حل - اس کتاب میں اُن مسائل سے بحث کیگئی ہے جن کا تعلق ہندوستان کی موجودہ سیاسی و اقتصادی حالت اور آیندہ ترقی سے ہے - لاجواب تصنیف ہے - انگریزی ایڈیشن قیمت ایک روپیہ

جداگانہ یا مشترک انتخاب - اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کو ہندوستان کی حکومت اختیاری کی ذمہ داری میں دوسری قوموں کے ساتھ حصہ ملنے کے لیے ضرورت ہے کہ مشترکہ انتخاب کا طریقہ جاری کیا جائے قیمت ۸ر

مسئلہ سود اور مسلمانوں کا مستقبل - تجارتی، صنعتی - اقتصادی اور کاروباری کامیابی کا راز اور مسلمانوں کو تباہی و بربادی کے گرداب سے نکالنے کی تدابیر معلوم کرنی ہو تو اس کتاب کو پڑھیے - قیمت ۱۲ر

سود و قمار کے متعلق پانچ مفید کتابیں جسمیں مسلمانوں کو کفایت شعاری کی تعلیم دینے اور اُنکی اقتصادی حالت درست کرنے کے طریقے بتائے گئے ہیں قیمت ۱۵ر مع محصولڈاک

مسلمانوں کے افلاس کا علاج - سیاسی و تاریخی واقعات کی روشنی میں مسلمانوں کی موجودہ اقتصادی و تعلیمی پستی کے اصلی اسباب بتائے گئے ہیں قیمت عہ ر

ملنے کا پتہ :- روہیلا بک ڈپو - بہنی تال روڈ - بریلی (یو - پی)

مطبوعہ نظامی پریس بدایوں۔ محمد احمد الدین پرنٹر